دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۹۳ | ماہ جمادی الآخر ۱۴۳۵ھ مطابق ماہ اپریل ۲۰۱۴ء | عدد ۴

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

شذرات

دارالمصنّفین کی اساس سیرت نبویؐ کی خدمت پر رکھی گئی ہے۔ اس میدان میں اس کی خدمات غیر معمولی ہیں۔ یہاں 'سیرت النبیؐ' جیسی شہرۂ آفاق کتاب لکھی گئی جس کا بدل اب تک ممکن نہیں ہوسکا۔ اس موضوع پر یہاں سے 'خطبات مدراس' جیسی بے بہا کتاب شائع ہوئی۔ چھوٹے بچوں اور کم پڑھے لکھے لوگوں کے لیے 'رحمت عالمؐ' جیسی بے مثال کتاب شائع ہوئی۔ ۷۵ سال پہلے جب وہ پہلی بار شائع ہوئی تو اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ اس کی فروخت سے حاصل ہونے والی آمدنی سے چار ہزار کے قریب ندوہ کے تعمیر فنڈ میں منتقل کیا گیا۔ یہ قبول عام اب بھی اسی طرح قائم ہے۔ بدقسمتی سے اس کے بعد دارالمصنّفین میں سیرت پر کوئی کام نہیں ہوسکا۔ رسول اکرمؐ کے نام، کام اور پیغام کو تمام انسانوں تک پہنچانے کی ضرورت ہمیشہ باقی رہے گی۔ اسی احساس کے زیر اثر چند سال پہلے دارالمصنّفین میں سالانہ سیرت سیمینار کا آغاز کیا گیا۔ ۲۳-۲۴ مارچ کو اس سلسلہ کا تیسرا سیمینار منعقد ہوا۔ گذشتہ سال کے سیمینار کا موضوع 'حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی' تھا۔ ظاہر ہے اتنے اہم اور وسیع الاطراف موضوع کا حق ایک یا چند سیمیناروں میں ادا نہیں کیا جاسکتا۔ محسوس کیا گیا کہ اس موضوع پر، جو موجودہ حالات کے تناظر میں خاص طور سے غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے، کم از کم ایک اور سیمینار کرایا جائے۔ بحمداللہ یہ سیمینار بہت کامیاب رہا۔ نبی کریمؐ کی مکی زندگی کے بہت سے گوشے زیر بحث آئے جیسا کہ اسی شمارہ میں شامل اشاعت رپورٹ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مقالات پر سوال و جواب کا پورا موقع فراہم کیا گیا اور اس کے نتیجہ میں زیر بحث موضوعات کے بہت سے نئے پہلو ابھر کر سامنے آئے۔ سوال و جواب کے علاوہ سیرت سیمینار میں چند اور باتوں کا اہتمام کیا جاتا ہے جن کا عام طور پر چنداں لحاظ نہیں کیا جاتا۔ سیمینار کی تاریخ کا بہت پہلے اعلان کردیا جاتا ہے اور اس بات پر اصرار کیا جاتا ہے کہ مقالات وقت سے پہلے موصول ہوجائیں تاکہ سیمینار کے وقت انہیں ایک مجموعہ کی صورت میں شرکاء کی خدمت میں پیش کیا جاسکے۔ عام طور پر مقالہ نگاران پابندیوں کے عادی نہیں ہیں اس لیے کئی بار زحمت کی صورت پیدا ہوجاتی ہے۔ امید کی جانی چاہیے کہ وقت کے ساتھ ساتھ صورت حال میں بہتری آئے گی، یہ روایت مضبوط ہوگی اور دارالمصنّفین کا سیرت سیمینار ایک اعلیٰ درجہ کے مثالی سیمینار کی حیثیت اختیار کرلے گا جس میں شرکت کی خواہش کی جائے۔

لکھنؤ سے علامہ شبلی کا بڑا گہرا تعلق رہا ہے۔ تحریک ندوۃ العلماء سے ان کا تعلق بالکل ابتدا سے

تھا اور وہ اس میں دل وجان سے شریک تھے۔ندوہ ان کی امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز تھا۔اس نسبت سے ان کا لکھنؤ آنا جانا لگا رہتا تھا۔۱۹۰۴ء میں الندوہ کے اجراء کے بعد یہ تعلق اور بھی مضبوط ہوگیا۔۱۹۰۵ء میں معتمد تعلیم منتخب ہوئے اور حیدرآباد کی ملازمت سے مستعفی ہوکر ہمہ تن ندوہ کی خدمت میں مصروف ہوگئے۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۳ء تک جب حالات کے جبر کے تحت انہوں نے معتمدی سے استعفا دیا وہ زیادہ تر لکھنؤ میں مقیم رہے اور اپنی تمام تر صلاحیتوں کو ندوہ کی تعمیر وترقی اور طلبہ کی تعلیم وتربیت میں صرف کردیا۔ندوہ کی وہ مخصوص شناخت جس سے وہ جانا اور پہچانا گیا دراصل علامہ شبلی کی دین ہے۔ان کے زیر تربیت وہاں طلبہ کی جونسل تیار ہوئی اور جسے سید الطائفہ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ع 'تیرے فرزندان ندوہ، تیری کوشش کے ثمر، سے تعبیر کیا ہے، وہ ندوہ کی طویل اور روشن تاریخ میں گل سرسبد کی حیثیت رکھتی ہے۔سید سلیمان ندوی، عبدالسلام ندوی، عبدالباری ندوی اور ان کے دوسرے ہم چشم برصغیر کے آسمان علم و دانش پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے اور ایک عالم کو اپنی تابانی سے منور کیا۔ چنانچہ اب جب کہ اس محسن ملک وقوم کے انتقال پر ایک صدی پوری ہونے والی ہے اور ملک کے مختلف گوشوں میں ان کی خدمات کی یاد تازہ کرنے اور ان کو عقیدت ومحبت کا خراج پیش کرنے کی تیاریاں ہورہی ہیں، اہالیانِ لکھنؤ نے بھی اس ذمہ داری کو محسوس کیا اور ان کی یاد میں ایک سمپوزیم کا اہتمام کیا۔ یہ سمپوزیم نیوکلیس ایجوکیشنل اینڈ ویلفیر سوسائٹی کے زیر اہتمام ۲۹/ مارچ کو جے شنکر پرساد آڈیٹوریم میں منعقد ہوا۔اس کی صدارت پروفیسر اختر الواسع، کمشنر برائے لسانی اقلیات، نے کی۔نظامت کے فرائض ڈاکٹر عمیر منظر، استاد شعبہ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس نے کی۔ڈاکٹر عمیر منظر ہی دراصل اس پروگرام کے روح رواں تھے اور انہی کی دلچسپی اور کوشش سے اس کا انعقاد ممکن ہوسکا۔یہ ایک عجیب حسن اتفاق ہے کہ جے شنکر پرشاد آڈیٹوریم سے ملی ہوئی لکھنؤ کی تاریخی بارہ دری ہے جہاں علامہ شبلی نے سوا سو سال پہلے اپنی پہلی علمی کاوش ''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم'' پیش کی تھی جس کے مطلع سے ان کی عظمت کا آفتاب پہلی مرتبہ طلوع ہوا تھا۔اسی بارہ دری کے سایہ میں لکھنؤ کے محبان شبلی ان کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ڈاکٹر شاہ محمد فائز نے استقبالیہ پیش کیا۔ پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے اپنی پیرانہ سالی، بیماری اور ضعف کے باوجود اس محفل کو رونق بخشی اور اپنے رچے ہوئے اسلوب میں موضوع پر اظہار خیال کیا۔انہوں نے جامعات کے شعبہ اردو میں شبلی چیر کے قیام کی تجویز پیش کی۔علامہ شبلی کی شخصیت، خدمات اور افکار پر اظہار خیال کرنے والوں میں جناب فضل الرحمٰن، نمائندہ روزنامہ انقلاب، ڈاکٹر عمیر منظر، پروفیسر ملک زادہ منظور احمد، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، راقم حروف اور پروفیسر اختر الواسع

شامل تھے۔اس موقع پر ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کی کتاب 'شبلی شناسی کے سو سال' کی رسم اجراء بھی انجام پائی۔صدارتی خطاب کے بعد جناب نثار احمد کے اظہار تشکر پر سمپوزیم کا اختتام ہوا۔اس سمپوزیم کی کامیابی میں نثار احمد صاحب کی کوششوں کا بڑا دخل رہا ہے۔بلاشبہ یہ ایک پر وقار اور کامیاب پروگرام تھا۔اس موقع پر منتظمین کی طرف سے اس عزم کا اظہار کیا گیا کہ آنے والے دنوں میں اس موضوع پر ایک اچھے سمینار کا اہتمام کیا جائے گا،انشاءاللہ۔

مشہور سائنسداں اور مسلم یونیورسٹی کے مایہ ناز فرزند پروفیسر اسد احمد ۳۰/ مارچ کو کینیڈا میں انتقال کر گئے۔مسلمانوں میں سائنسی علوم کے ماہرین کی یوں بھی بڑی کمی ہے،اس وجہ سے اس سانحہ کی شدت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔پروفیسر اسد احمد ۸/نومبر ۱۹۳۹ء میں سہارنپور میں پیدا ہوئے۔تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں حاصل کی جہاں سے بی۔ایس۔سی ، ایم۔ایس۔سی اور پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ایم۔ایس۔سی میں گولڈ میڈل کے حقدار ٹھہرے۔اس کے بعد انہوں نے امریکہ کے مشہور تعلیمی ادارے Yale University سے امتیاز کے ساتھ دوبارہ پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ان کی تحقیق کا موضوع Molecular Genetics تھا۔کچھ عرصہ ڈلہوزی یونیورسٹی ، ہالی فیکس میں تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد کینیڈا میں البرٹا یونیورسٹی سے وابستہ ہو گئے۔انہوں نے وہاں Molecular Genetics کے علاوہ (Recombinant DNA Technology) کے میدان میں گراں قدر تحقیقی خدمات انجام دیں اور اپنی قوم اور مادر علمی کا نام روشن کیا۔مطالعہ کا بڑا استھرا ذوق تھا۔ان کے پاس سائنس کے علاوہ تاریخ اور تہذیب عالم کے موضوعات پر کتابوں کا بڑا اچھا ذخیرہ تھا۔۱۹۹۴ء میں ریٹائرمنٹ کے بعد پروفیسر امریطس کی حیثیت سے مطالعہ و تحقیق میں برابر مصروف رہے۔انہیں اپنی مادر علمی سے بڑا گہرا جذباتی لگاؤ تھا۔گذشتہ پندرہ برسوں سے مسلم یونیورسٹی میں سمر یونیورسٹی (Summer University) کے انعقاد میں ان کا کردار کلیدی اہمیت کا حامل رہا ہے۔اس پروگرام کے انعقاد کے پیچھے یہ احساس کارفرما رہا ہے کہ ہمارے طلبہ علمی دنیا میں رونما ہونے والی تیز رفتار پیش رفت سے پوری طرح آگاہ نہ ہونے کے باعث مقابلہ کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتے ہیں اور خاص طور سے مغربی ممالک میں اعلیٰ تعلیم و تحقیق کے مواقع سے محروم رہ جاتے ہیں۔اس پروگرام کا بنیادی مقصد اس کمی کو دور کرنا اور اس خلیج کو پر کرنا ہے۔یہ کام ملی خدمت کے جذبہ سے کیا جا رہا ہے۔اللہ تعالیٰ اسے شرف قبول بخشے،مرحوم کی مغفرت فرمائے اور ان کے درجات کو بلند فرمائے۔آمین!

مقالات

لفظ ''قران'' بروزنِ زبان کیا فارسی کا تصرف ہے؟

ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی

(۱)

کتاب الٰہی کا نام ''قرآن'' دراصل ''قراءۃ'' کی طرح فعل قرأیقرأ کا مصدر ہے، اور اسم مفعول یعنی ''مقروء'' کے معنی میں ہے (۱)۔ عربی زبان میں ایک فعل کے بسا اوقات کئی مصدر آتے ہیں، اور مصدر کا اسم مفعول کے معنی میں استعمال بھی عام ہے۔ ''کتاب'' کا لفظ بھی ''کَتْب'' اور ''کتابۃ'' کی طرح مصدر ہے اور مکتوب (لکھی ہوئی چیز) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ خود ''لفظ'' (بولنا) بھی ہم ملفوظ کے معنی میں بولتے ہیں۔

قرآن مجید تو معجزہ ہے ہی، اس کا یہ نام بھی کسی اعجاز سے کم نہیں، کہ اپنے نزول کے بعد سے آج تک جس کثرت، تسلسل اور اہتمام سے اللہ تعالیٰ کی یہ آخری کتاب پڑھی جارہی ہے، دنیا کی کوئی کتاب نہیں پڑھی جاتی۔

''قرآن'' کا لفظ کتاب اللہ میں عموماً اس کے نام کے طور پر آیا ہے، لیکن بعض مقامات پر اپنے لغوی مصدری معنی میں بھی استعمال ہوا ہے، جیسے سورہ قیامہ میں ارشاد ہے:

ان علینا جمعه و قرء انه فاذا قرأنا ہ فاتبع قرء انه۔

خلیفۂ سوم حضرت عثمان ذوالنورین کی شہادت پر حضرت حسان بن ثابت کا مشہور شعر ہے:

ضحّوا بأشمط عنوان السجود به یقطِّع اللیلَ تسبیحاً و قرآنا (۲)

ریاض۔ سعودی عرب۔

اس شعر میں تسبیح کی طرح لفظ قرآن بھی مصدر ہے اور دوسرے مصرعے کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عثمان کی راتیں تسبیح اور تلاوت میں گزرتی تھیں۔

لفظ قرآن کا صرفی وزن (غفران، سبحان، کفران کی طرح) فُعلان ہے۔لیکن کیا اسے فُعان کے وزن پر قران بھی کہہ سکتے ہیں؟

(۲)

مرزا غالب نے اپنے خطوط میں ایک جگہ اس شکل پر اپنے مخصوص انداز میں جس میں تندی بھی ہے اور تمسخر بھی، اعتراض کیا ہے، اگر چہ یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ انہیں سرے سے اس کے وجود سے انکار ہے یا ان کے نزدیک اس کا استعمال فصاحت کے خلاف ہے۔شہاب الدین احمد خاں ثاقب کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''تم علاء الدین خاں کو لکھو کہ بڑے شرم کی بات ہے کہ

ہر دم آزردگیِ غیر سبب را چہ علاج

اس غزل کو حافظ کی غزل سمجھتے ہو۔واہ وا! 'غیر سبب' یہ کہاں کی بولی ہے!

از خواندنِ قران تو فارسی چہ فائدہ

عیاذاً باللہ امیر خسرو قرآن کو کہ بسکون رائے قرشت والف ممدودہ ہے، قران بروزن پران لکھیں گے؟ یہ دونوں غزلیں دو گدھوں کی ہیں، شاید ایک نے مقطع میں حافظ اور ایک نے مقطع میں خسرو لکھ دیا ہو!''۔(۳)

قاضی عبدالودود نے اپنے طویل اور محققانہ مضمون ''غالب بحیثیت محقق'' میں یہ بتانے کے بعد کہ موخرالذکر مصرعہ خسرو کے دواوین میں ان کی نظر سے نہیں گزرا اور غالباً ان کا نہیں ہے، مرزا کے جواب میں تین باتیں لکھی ہیں۔دو باتوں کی نوعیت الزامی ہے، البتہ تیسری بات بنیادی اور فیصلہ کن ہے اور وہ یہ کہ ''یہ لفظ اسی طرح فحول اساتذۂ ایران کے یہاں آیا ہے''۔یعنی اصل صورت کے ساتھ ساتھ یہ دوسری صورت بھی ان اساتذہ کے کلام میں ملتی ہے۔قاضی صاحب نے اپنے دعوے کے ثبوت میں لبیبی ، فرخی، منوچہری، قطران اور ناصر خسرو وغیرہ کے کلام سے ۱۶ سندیں پیش کی ہیں (۴)۔ناصر کے جو متعدد اشعار نقل کیے ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے:

اگر گوئی ایں در قراں نیست گویم ہمانا نکو می ندانی قراں را

اسی قصیدے میں درج ذیل ابیات بھی ہیں جن میں زیر بحث صورت کا استعمال ہوا ہے:

قراں را یکے خازنے ہست کایزد حوالہ بدو کرد مر انس و جاں را

معانی قراں را ہمی زاں ندانی کہ طاعت نداری روانِ قراں را

قراں خوانِ معنی است ہاں اے قراں خواں یکے میزباں کیست ایں شہرہ خواں را (۵)

قاضی صاحب نے حکیم سنائی کی حدیقۃ الحقیقہ سے درج ذیل مصرعہ بھی نقل کیا ہے جس میں دونوں صورتیں جمع ہیں:

سرّ قرآں قراں نکو داند

حدیقہ ہی کا ایک اور شعر ہے:

تا بروں ناید از حدث انساں کے بروں آید از حروف قراں (۶)

غالب کی طرح دیوان غالب کے شارح سید علی حیدر نظم طباطبائی بھی لفظ قرآن کی اس شکل پر معترض ہیں۔ انہوں نے اپنی شرح میں ایک جگہ میر تقی میر کی غلطیوں کو یکجا کیا ہے۔ ان کے نزدیک میر و سودا ''محاورے کے آگے نہ غلطی کی پروا کرتے تھے نہ قواعد کا خیال رکھتے تھے''۔ موصوف نے میر کے مندرجہ ذیل شعر کے دوسرے مصرعے کو بھی ان کی غلطیوں میں شمار کیا ہے:

مت مانیو کہ ہوگا یہ بے درد اہل دیں گر آوے شیخ پہن کے جامہ قران کا (۷)

طباطبائی نے اگرچہ یہ وضاحت نہیں کی کہ اس میں کیا غلطی ہے، لیکن بہ ظاہر ان کا اشارہ لفظ ''قران'' کی جانب ہے، جیسا کہ رشید حسن خاں نے لکھا ہے۔(۸)

معلوم نہیں طباطبائی غالب کے مکتوب سے متاثر تھے یا ان کے اعتراض کی بنیاد ان کے اس دعوے پر ہے کہ ''عربی لفظ میں عجم کا تصرف نامقبول ہے، سوا چند محاوروں کے کہ وہاں حکم عجمہ پیدا ہو گیا ہے جیسے کافر ہے'' اور اسی بنا پر ان کے نزدیک غالب کے شعر:

نامہ بنازد بہ خویش کز اثرِ فیضِ مدح نقطہ زبس روشنی تابش نیّر گرفت

میں اقوا کا عیب پایا جاتا ہے کیوں کہ اس کی زمین اختر گرفت اور اخگر گرفت ہے۔ فرماتے ہیں: ''اساتذۂ اہل زبان جو عربی داں گزرے ہیں انہیں ایسا دھوکا ہو جائے ممکن نہیں، ہاں

جو زبانِ عربی سے نا آشنا ہیں اگر ان کے کلام میں نیّر کہیں اختر کے ساتھ آ بھی گیا ہو تو قابل استناد نہیں ہوسکتا''۔(۹)

لفظ نیر کی بابت تو اب یہ فرض ماہرین غالبیات کا ہے کہ اساتذۂ اہل زبان کے کلام سے غالب کے حق میں سند پیش کریں۔البتہ لفظ ''قران'' کے بارے میں قاضی عبدالودود نے جن اساتذہ کے کلام سے سندیں پیش کی ہیں ان میں سے اکثر عربی داں بھی تھے، خصوصاً حکیم ناصر خسرو جس کے کلام میں یہ صورت زیادہ نظر آتی ہے فارسی کے ساتھ عربی کا بھی صاحب دیوان شاعر تھا۔(۱۰)

(۳)

قاضی صاحب کے بعد اس موضوع پر رشید حسن خاں نے قلم اٹھایا۔''صحتِ الفاظ'' کے عنوان سے ایک فاضلانہ مضمون ان کے مجموعۂ مضامین ''زبان اور قواعد'' میں شامل ہے اور ۱۴۵ صفحات پر مشتمل ہے۔اس مضمون میں انہوں نے ایک مشہور کتاب قاموس الاغلاط پر تبصرہ کرتے ہوئے صحت الفاظ کے موضوع پر دادِ تحقیق دی ہے۔

قاموس الاغلاط کے مصنّفین نے بھی لفظ قرآن کے بارے میں لکھا تھا کہ الف مقصورہ سے قران کہنا غلط ہے۔رشید حسن خاں نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مرزا غالب کے خط، میر پر نظم طباطبائی کے اعتراض اور قاضی عبدالودود کی سندوں کا حوالہ دینے کے بعد لکھا:

''اس لفظ میں اصلاً اساتذۂ فارسی نے تصرف کیا ہے اور اس کو بروزن ''زبان'' نظم کیا ہے۔قران بروزن زبان کو عوام کا گڑھا ہوا لفظ غالباً دو وجہوں سے سمجھا گیا۔ایک تو یہ کہ فارسی کے اس تصرف کا ذکر فارسی کے لغات میں نہیں ملتا۔دوسرے یہ کہ ہندی کے بعض دوہوں میں یہ اسی طرح آیا ہے......
ان وجوہ سے یہ سمجھا گیا کہ بہ الف مقصورہ غیر مستند ہے''۔(۱۱)

اس کے بعد رشید حسن خاں نے ثابت کیا کہ فارسی کی طرح اردو کے مستند شعرا نے بھی قران بروزن زبان نظم کیا ہے۔میر کے شعر کے علاوہ جو طباطبائی کے حوالے سے اوپر گزرا، خاں صاحب نے میر سوز، انشا، میر امانی اسد اور قائم چاند پوری وغیرہ کے کلام سے سندیں پیش کیں جن میں سے چند یہ ہیں:

یار مجھ کو قران کی سوگند جی چلا تیری جان کی سوگند

(میر سوز)

کھا قسم جھوٹ بولے ہے کتنا چپ ہو چپ بس قران کے صدقے

(انشا)

سب حفظِ قران دے کے برباد اک رکھے ہے آیۂ کلوا یاد

(قائم چاندپوری)

اوپر فارسی لغات کے بارے میں رشید حسن خاں کا بیان گزرا کہ ان میں فارسی کے اس تصرف کا ذکر نہیں ملتا۔ اردو لغات کا جب انہوں نے جائزہ لیا تو نوراللغات کے سوا کسی لغت میں یہ صراحت نہیں ملی کہ اردو میں لفظ قرآن کی یہ صورت بھی مستعمل ہے۔ حالانکہ فرہنگ آصفیہ اور سرمایۂ زبان اردو میں ''قرآن کا جامہ پہننا'' کی سند میں میر کا وہی مذکورہ شعر درج کیا ہے لیکن یہ تصریح نہیں کی کہ اس میں قران بروزن زبان نظم ہوا ہے (۱۲)۔ صاحب نوراللغات نے البتہ تحفۃ العراقین کا ایک شعر نقل کرتے ہوئے واضح طور پر لکھا کہ ''فارسیوں نے قران بروزن زبان بھی کہا ہے''۔ جہاں تک اردو کا تعلق ہے تو یہ وضاحت کی کہ ''اردو میں عورتیں قران بروزن زبان ہی بولتی ہیں'' (۱۳)۔ رشید حسن خاں فرماتے ہیں کہ ''اس میں یہ اضافہ کرنا چاہیے کہ عام لوگ بھی اس طرح بولتے ہیں۔ بہرحال اردو میں اس لفظ کو دونوں طرح صحیح مانا جائے گا''۔ (۱۴)

اوپر کی بحث سے یہ بات قطعی طور پر پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ قران بروزن زبان کا استعمال درست ہے، اور یہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے قدیم اور مستند شعرا کے کلام میں ملتا ہے۔ اس طرح مرزا غالب وغیرہ کے بیانات سے اس مسئلے میں جو الجھاؤ پیدا ہوا تھا وہ ختم ہوگیا۔ لیکن کیا یہ صورت فارسی کا تصرف ہے؟

(۴)

فارسی اور اردو لغات اس مسئلے پر خاموش ہیں۔ نوراللغات کا بیان کہ ''فارسیوں نے قران بروزن زبان بھی کہا ہے'' اپنی جگہ بالکل درست ہے، لیکن یہ بات کہ یہ تصرف فارسیوں کا تھا اس بیان سے بہ صراحت ثابت نہیں ہوتی، ''مفہوم مخالف'' البتہ اس کا یہ ہوسکتا ہے۔

قاضی عبدالودود نے بھی ''فحول اساتذۂ ایران'' کے کلام سے اسناد پیش کرنے پر اکتفا کیا اور یہ بحث نہیں چھیڑی، کیونکہ زیر بحث شعر فارسی کا تھا۔ قاموس الاغلاط کے مصنّفین کے جواب میں رشید حسن خاں نے اردو کے اساتذہ کے کلام سے مثالیں پیش کیں اور یوں یہ قضیہ فیصل ہوگیا۔ لیکن شاید نور اللغات کے مندرجات کی روشنی میں وہ یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ ''اس لفظ میں اصلاً اساتذۂ فارسی نے تصرف کیا ہے اور اس کو بروزن زبان نظم کیا ہے''۔ (۱۵)

یہ خاکسار مضمون نگار عرض کرتا ہے کہ یہ خیال درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ لفظ قرآن کی یہ صورت بھی عربی زبان میں قرن اول سے مسلسل ہر عہد میں رائج رہی ہے۔ شعرا کے کلام میں بے شمار مثالیں اس کے استعمال کی ملتی ہیں۔ مثالیں آگے آئیں گی، لیکن اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ قراے سبعہ میں سے ایک مشہور قاری امام عبداللہ بن کثیر مکی کی قراءت ہی یہی ہے۔ قرآن مجید میں جہاں بھی لفظ قرآن آیا ہے، معرفہ ہو کہ نکرہ، مرفوع ہو کہ منصوب کہ مجرور، مضاف ہو کہ اضافت کے بغیر، ہر صورت میں وہ اسے ''قران'' بروزن ''فُعان'' پڑھتے تھے۔ یہی قراءت قراے سبعہ میں سے ایک دوسرے قاری حمزہ زیات (۸۰-۱۵۶ھ) کی بھی ہے لیکن صرف وقف کی صورت میں۔ (۱۶)

امام عبداللہ بن کثیر مکہ مکرمہ میں ۴۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۰ھ میں وفات پائی۔ ان کا شمار تابعین میں ہوتا ہے۔ مکہ مکرمہ میں جن صحابہ کرام سے ان کی ملاقات ہوئی ان میں تذکرہ نگاروں نے حضرت عبداللہ بن الزبیر، حضرت ابوایوب انصاری اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہم کے نام ذکر کیے ہیں۔

وہ محدث بھی تھے۔ ان کی احادیث کتب ستہ میں نقل ہوئی ہیں اور ابن معین، علی بن المدینی اور نسائی وغیرہ نے انہیں ثقہ قرار دیا ہے، لیکن ان کی اصل شہرت مکہ مکرمہ کے امام قراءت کی تھی۔ سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں کہ مکہ مکرمہ میں حمید بن قیس اور عبداللہ بن کثیر سے بڑا قاری کوئی نہ تھا۔ قرآن مجید انہوں نے حضرت عبداللہ بن السائب مخزومی رضی اللہ عنہ، مجاہد بن جبر اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے غلام درباس سے پڑھا تھا۔ (۱۷)

حضرت عبداللہ بن السائب کمسن صحابہ میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے قرآن مجید

حضرت ابی بن کعب اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما سے پڑھا تھا۔(۱۸) مجاہد اور درباس کے استاذ حضرت عبداللہ بن عباس اور ان کے استاذ حضرت ابی بن کعب تھے۔(۱۹)

امام شافعی (۱۵۰-۲۰۴ھ) نے قرآن مجید ابن کثیر کے شاگرد اور اپنے عہد میں مکہ مکرمہ کے امام قراءت اسماعیل بن عبداللہ مکی (۱۰۰-۱۷۰ھ) سے پڑھا تھا۔ چنانچہ امام شافعی بھی ''قران'' بروزن زبان پڑھتے تھے۔(۲۰)

آج بھی عالم اسلام کے جن مدارس اور جامعات میں فن قراءت کی تدریس ہوتی ہے، ان کے اساتذہ اور طلبہ سے ابن کثیر کی یہ قراءت پڑھی اور سنی جاسکتی ہے۔

لفظ قرآن میں یہ تصرف دراصل عربی زبان کے مشکل ترین حلقی حرف ہمزہ کا رہین منت ہے۔اس حرف سے صوتیات، صرف، لغت اور املا، ان سب سطحوں پر اتنے مسائل وابستہ ہیں کہ فن قراءت اور قواعد کی کتابوں میں ایک پورا باب ہمزہ کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے(۲۱)، بلکہ بعض علما نے پورے پورے رسائل ''کتاب الھمز'' کے نام سے اس کے بارے میں تصنیف کیے ہیں۔(۲۲)

صوتی سطح پر ہمزہ کے بارے میں عرب قبائل کے دو نمایاں رجحانات رہے ہیں۔اہل نجد بالخصوص بنی تمیم کا مسلک ''تحقیق'' کا تھا۔یعنی ہر حرف کو اس کے اصل مخرج سے اس کی تمام صفات کے ساتھ ادا کرنا۔اس کے برخلاف اہل حجاز عموماً ''تخفیف'' کی جانب میلان رکھتے تھے۔تخفیف کی مختلف شکلیں ہیں، ان میں سے ایک شکل وہ ہے جو لفظ قران میں پائی جاتی ہے۔

اس لفظ میں تبدیلی جس قاعدے کی بنیاد پر ہوئی وہ یہ ہے کہ ہمزہ جب کسی لفظ کا درمیانی حرف ہو اور متحرک ہو، اور اس سے قبل حرفِ صحیح ساکن ہو تو ہمزہ کی حرکت کو ماقبل پر ڈال کر ہمزہ کو حذف کر سکتے ہیں (۲۳)۔لفظ قرآن کی اصل ''قُرْ ءَان'' ہے۔ہمزہ کو حذف کر کے اس کا فتحہ ماقبل یعنی راء پر منتقل کر دیا اس طرح ''قُرَ ان'' بن گیا۔

عربی زبان میں عورت کے لیے عام لفظ مَرْ أة ہے۔اس کی ایک شکل مَرَ ة ہے۔اس میں بھی یہی تبدیلی ہوئی ہے۔ یہ لفظ قدیم میں بھی مستعمل رہا ہے اور آج بھی بولتے ہیں خاص طور پر اضافت کی صورت میں مثلاً مَرَ تی یعنی میری عورت۔ یہ تبدیلی اہل زبان کے نزدیک قیاسی

یعنی قاعدے کے مطابق ہے (۲۴)۔شعرا کو وزن کی پابندی کرنی پڑتی ہے اس لیے اس طرح کی سہولتوں سے انہیں بہت مدد ملتی ہے۔

یہاں اس تبدیلی کی دو مثالیں قریش کے دو قدیم شعرا کے کلام سے دی جاتی ہیں:

قرن اول کا منفرد غزل گو شاعر عمر بن ابی ربیعہ (۲۳-۹۳ھ) ایک قصیدے میں کہتا ہے:

كأن إسفنطة شيبت بذي شبم من صوب أزرق هبّت ريحه شَمَلا (۲۵)

اس شعر کا آخری لفظ اصل میں "شَمْأً لاً" تھا۔ہمزہ حذف ہوا اور اس کا فتحہ میم کو منتقل ہوا تو یہ صورت بنی۔

قرن اول ہی کے ایک اور شاعر عبیداللہ بن قیس الرقیات (ف ۸۵ھ) نے لفظ "مُسْتَلْئِم" بمعنی زرہ پوش کو ایک شعر میں "مُسْتَلِم" نظم کیا ہے، کہتا ہے:

كانت حصوناً لهم سيوفهُمُ وكلُّ حامي الحفاظ مستلِمِ (۲۶)

یہاں بھی تخفیف کا وہی اصول کام کر رہا ہے۔لفظ مسئلہ کا بھی یہی مسئلہ ہے۔عربی میں اس کی ایک شکل "مَسَلَه" بھی ہے، بلکہ تہذیب اللغہ کے مصنف ازہری (ف ۳۷۰ھ) نے کوفہ کے مشہور امام نحو ابوزکریا الفراء (م ۲۰۷ھ) سے نقل کیا ہے کہ (بول چال میں) مَسَلَه کا استعمال زیادہ ہوتا ہے (۲۷)۔اردو میں توالیِ حرکات ثقالت کا موجب ہے اس لیے سین کو ساکن کر کے مَسْلَه بولتے ہیں۔درجہ، غلبہ، صدقہ، حرکت، برکت، عظمت، شفقت، ان سارے الفاظ میں بھی یہی صورت ہے۔عربی زبان میں یہ سب بہ فتح دوم ہیں، مگر اردو میں عام طور پر ان کا استعمال بہ سکون دوم ہوتا ہے۔

(۵)

اب قدیم عرب شعرا کے کلام سے لفظ قران بروزن زبان کے استعمال کی سندیں ملاحظہ ہوں۔آغاز قرن اول سے اور شاعر رسول حضرت حسان بن ثابت (ف ۵۴ھ) کے اشعار سے کرتے ہیں۔

۱- بنو قریظہ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

كفرتم بالقران وقد أُتيتم بتصديق الذي قال النذيرُ (۲۸)

۲-ایک اور قصیدے میں بنوجمح کے بارے میں کہتے ہیں:

جحدوا القران و کذبوا بمحمد والله یُظهر أمرَ کلِّ رسولِ (۲۹)

۳-ایمن بن خریم اسدی فتح مکہ کے روز اپنے باپ کے ساتھ اسلام لائے تھے۔ تقریباً ۸۰ھ میں وفات پائی (۳۰)۔ بنی ہاشم کی مدح میں ان کے قصیدے کا ایک شعر ہے:

ولیتم بالقران وبالتزکّي فأسرَعَ فیکمُ ذاک البلاءُ (۳۱)

۴-نجاشی حارثی حضرت حسان بن ثابت کی طرح مخضرم شاعر تھا، یعنی جاہلیت اور اسلام دونوں کے زمانے اسے ملے تھے، لیکن مدینہ منورہ میں اس کی آمد حضرت عمر فاروق کے عہد میں ہوئی۔ قبیلۂ بنی عجلان کی ہجو میں اس کے قصیدے کا دلچسپ مقدمہ مشہور ہے جو حضرت عمر کے سامنے پیش ہوا تھا۔ جنگ صفین میں حضرت علی کے ساتھ تھا لیکن جب رمضان میں شراب نوشی کے جرم میں پکڑا گیا اور حضرت علی نے کوڑے لگائے تو اہل کوفہ کی ہجو کی اور حضرت معاویہ کے کیمپ میں چلا گیا۔ ۴۹ھ میں انتقال ہوا (۳۲)۔ جنگ صفین کے موقع پر اس کے ایک قصیدے کا شعر ہے:

فأصبح أهل الشام قد رفعوا القنا علیها کتاب الله خیر قرانِ (۳۳)

۵-حجاج بن یوسف کے مقربین میں ایک شاعر ابوجلدہ یشکری تھا۔ بعد میں عبدالرحمٰن بن محمد بن الاشعث کے ساتھ ۸۱ھ میں بغاوت کی۔ ۸۳ھ میں مکہ مکرمہ کے راستے میں وفات پائی (۳۴)۔ ابوجلدہ کا شعر ہے:

وأقلع بعد صبوته وأضحی طویل اللیل یهرف بالقران (۳۵)

۶-عبدالرحمٰن بن الحکم اموی خلیفہ مروان بن الحکم کا بھائی اور مشہور شاعر تھا۔ تقریباً ۷۰ھ میں انتقال کیا (۳۶)۔ زیاد بن ابیہ کے بارے میں اس کے قصیدے کا ایک شعر ہے:

حلفت برب مکة والمصلّی و بالتوراة أحلف و القران (۳۷)

۷-عتبہ بن ابی لہب کے پوتے فضل بن عباس "الاخضر اللہبی" کے لقب سے مشہور تھے۔ پیدائش و پرورش مکہ مکرمہ میں ہوئی۔ بعد میں اپنے والد کے ساتھ مدینہ منورہ منتقل ہو گئے تھے۔ وہیں تقریباً ۱۰۵ھ میں وفات پائی (۳۸)۔ ایک قصیدے میں کہتے ہیں:

ففي حكم القرانِ لنا مزيد على ما كان لا قال و قيل (۳۹)

دوسری صدی ہجری:

۸-عبدالملک بن مروان کا پوتا ولید بن یزید (۸۸-۱۲۶) ہشام بن عبدالملک کے بعد ۱۲۵ھ میں خلیفہ ہوا لیکن عیش و عشرت کا دلدادہ اور شاعر و مغنی تھا (۴۰)۔اس کے ایک ''ارجوزہ مزدوجہ'' کا شعر ہے:

ثم القرانُ والهدى السبيلُ قد بقيا لما مضى الرسولُ (۴۱)

۹- حاجب الفیل خراسان کا مشہور شہسوار اور شاعر، اور امیر خراسان یزید بن المہلب (۳۵-۱۰۲) کا مصاحب تھا۔اصل نام حاجب بن دینار (بعض مراجع میں ذبیان ہے) مازنی تھا (۴۲)۔اپنے حریف شاعر ثابت قطنہ (ف ۱۱۰ھ) کی ہجو میں کہتا ہے:

أما القران فلم تخلق لمحكمه ولم تسدَّد من الدنيا لتوفيق (۴۳)

۱۰-ابوحمزہ مختار بن عوف ازدی خوارج کے زعما میں سے تھا۔(۴۴) ۱۳۰ھ میں قتل ہوا تو عمرو بن حصین عنبری نے اس کا اور اس کے ساتھیوں کا مرثیہ لکھا جس کا ایک شعر ہے:

متأوّهٍ يتلو قوارعَ من آي القرانِ مفزَّعَ الصدرِ (۴۵)

۱۱-مشہور شیعہ شاعر السید الحمیری (۱۰۵-۱۷۳) (۴۶) ایک قصیدے میں کہتا ہے:

شهدت بذلک صدقاً کما شهدت بتصديق آي القرانِ (۴۷)

۱۲-خمریات کے مشہور شاعر ابونواس (۱۴۶-۱۹۸ھ) کا شعر ہے:

وقمتُ أسحب ذيلي عن هازلٍ بالقرانِ (۴۸)

تیسری صدی ہجری:

۱۳-ابوتمام اور بحتری کا شمار عہد عباسی کے عظیم شاعروں میں ہوتا ہے۔ابوتمام (۱۸۸-۲۳۱ھ) خلیفہ عباسی واثق باللہ کی مدح میں خلیفہ کے آباو اجداد کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:

قومٌ غدا الميراث مضروباً لهم سورٌ عليه من القران حصينُ (۴۹)

۱۴-ابوتمام ہی کے ایک اور قصیدے کا جو خلیفہ معتصم کی مدح میں ہے، آخری شعر ہے:

سُوَرُ القرانِ الغُرُّ فيكم أُنزلت ولكم تصاغ محاسنُ الأشعار (۵۰)

۱۵- بحتری (۲۰۲-۲۸۴ھ) ایک قصیدے میں فتنۂ خلق قرآن کے سرغنہ قاضی ابن ابی دوٗاد اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں کہتا ہے:

إذا أصحابه اصطبحوا بليل أطالوا الخوضَ في خلق القرانِ (۵۱)

۱۶- بحتری ہی کا ایک اور شعر ہے:

بما أنزل اللّٰه العظيمُ جلالُه قرانًا على لفظ النبي محمدِ (۵۲)

۱۷- اسی عہد کا ایک مشہور شاعر علی بن الجہم (ف ۲۴۹ھ) تھا امام احمد بن حنبل کا معتقد تھا اور امام احمد کے بعض اقوال اسی کے واسطے سے نقل ہوئے ہیں (۵۳)۔ علی بن الجہم نے ۳۳۰ اشعار کا ایک طویل ''ارجوزۂ مزدوجہ'' لکھا تھا جس میں تاریخ اسلام کے اہم واقعات کو نظم کیا تھا اور یہ اس نوع کی پہلی کوشش تھی۔ اسی نظم کا ایک شعر ہے:

من سورة الحشر وفي آيات من القران غير مشكلات (۵۴)

۱۸- اوپر حکیم سنائی کا ایک مصرعہ گزرا ہے جس میں لفظ قرآن کی دونوں صورتیں جمع ہیں۔ یہی حال علی بن الجہم کے اس شعر کا بھی ہے:

ما قد تولّى شرحه القرآنُ وفي القران الصدقُ والبيانُ (۵۵)

۱۹- ابراہیم بن عباس صولی (۱۷۶-۲۴۳) نامور ادیب اور شاعر تھا۔ عباسی خلفا معتصم، واثق اور متوکل تینوں کے عہد میں ''کاتب'' یعنی سکریٹری رہا (۵۶)۔ مولانا عبدالعزیز میمن نے اس کا دیوان مرتب کیا تھا جو الطرائف الادبیہ نامی مجموعے میں شامل ہے۔ صولی کا ایک شعر ہے:

أعوّذه دائمًا بالقرانِ وأرمي بطرفي إلى حيث حَلّ (۵۷)

۲۰- علی بن محمد حمانی (ف تقریباً ۳۰۱ھ) کوفہ میں علویوں کا سردار اور ترجمان تھا۔ اس کا دعوی تھا کہ حضرت علی تک اس کے اجداد میں ہر شخص شاعر تھا (۵۸)۔ اہل بیت کی مدح میں ایک قصیدے میں کہتا ہے:

أناسٌ همُ عِدل القران ومألف الـ ـبيان وأصحاب الحكومة في البدر (۵۹)

۲۱- اسی شاعر کا ایک قصیدہ حضرت حسن اور حضرت حسین کی منقبت میں ہے اس کے دو شعر

ملاحظہ ہوں۔ پہلے میں لفظ قرآن اصل صورت میں جبکہ دوسرے میں زیر بحث شکل میں آیا ہے:

یا عدیلَ القرآن من بین ذی الخلـ ـق ویا واحدًا من الثقلین

أنتما والقرانُ في الأرض مذ أُنـ ـزِل مثل السماء والفرقدین (۶۰)

چوتھی صدی ہجری:

۲۲- امیر تمیم بن المعزلدین اللہ الفاطمی (۳۳۷-۳۷۵) ایک فاطمی خلیفہ کا بیٹا اور دوسرے فاطمی خلیفہ کا بھائی تھا۔ تونس میں پیدا ہوا اور ۳۸ سال کی عمر میں مصر میں انتقال کیا۔ صاحب دیوان شاعر تھا (۶۱)۔ اس کا دیوان عربی زبان کے مشہور ہندوستانی ادیب محمد حسن اعظمی (بوہرہ فرقے سے تعلق رکھتے تھے، بعد میں پاکستان منتقل ہوگئے تھے) نے مرتب کیا تھا۔ جسے مزید تصحیحات وتعلیقات کے ساتھ دارالکتب المصریہ نے ۱۹۵۷ء میں شائع کیا۔ امیر تمیم خلیفہ العزیز باللہ کی مدح میں کہتا ہے:

إمامٌ کأنّ اللّٰہ أنزل فضلَہ قرانًا فما خلقٌ من الناس جاھلہ (۶۲)

۲۳- نوروز کے موقع پر خلیفۂ مذکور کی تہنیت میں ایک قصیدہ لکھا جس کا دوسرا شعر ہے:

وأنک أنت الإمام الذي أبان لہ الفضل نصُّ القرانِ (۶۳)

۲۴- العزیز باللہ ہی کی شان میں ایک اور قصیدے میں کہتا ہے:

أری إرثنا في معشر یملکونہ ولم یعطھم إیاہ فرض قرانِ (۶۴)

۲۵- صاحب بن عباد (۳۲۶-۳۸۵ھ) بویہی سلطنت کا مشہور فاضل وزیر گزرا ہے۔ عربی زبان کا ادیب، انشاپرداز اور شاعر تھا (۶۵)۔ اس کے دیوان میں ۱۶۴ اشعار کا ایک قصیدہ ہے جس میں ہر شعر کا پہلا مصرعہ محبوبہ کی زبان سے اور دوسرا شاعر کی زبان سے ہے۔ محبوبہ شاعر سے جو شیعی اور معتزلی ہے اس کے عقائد کے بارے میں سوال کرتی ہے اور وہ جواب دیتا ہے۔ اسی قصیدے کا ایک شعر ہے:

قالت فھل معجز وافی الرسول بہ قلتُ القرانُ وقد أعیا علی الأُوّلِ (۶۶)

یہ پچیس سندیں جو پہلی صدی ہجری سے چوتھی صدی ہجری تک کے شعرا کے کلام سے منتخب کی گئی ہیں یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ لفظ قران بروزن زبان کا استعمال فارسیوں کا

تصرف نہیں ہے، بلکہ عربی زبان میں اصلی اور معروف صورت کے ساتھ ساتھ یہ صورت بھی شروع ہی سے رائج رہی ہے۔اور جیسا کہ ناظرین نے دیکھا اس میں کسی قبیلے، کسی زمانے اور کسی شاعر کی تخصیص نہیں تھی۔ بلکہ مسئلہ صرف وزن کا تھا۔ وزن کا تقاضا ہوا تو ایک ہی شعر میں دونوں صورتیں اکٹھا ہو گئیں۔

اس تفصیل سے رشید حسن خاں کا وہ اشکال بھی رفع ہو گیا کہ ''فارسی کے اس تصرف کا ذکر فارسی کے لغات میں نہیں ملتا''۔ ظاہر ہے جب یہ تصرف فارسی کا تھا ہی نہیں تو فارسی کے لغات میں کیوں کر ملتا!

حواشی اور حوالے

(۱) اس مضمون کا موضوع لفظ قرآن کی اصل اور اشتقاق نہیں ہے اس لیے یہاں دوسرے کمزور یا ناقابل التفات اقوال کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ان کے لیے تفاسیر اور علوم القرآن کی کتابوں کی جانب رجوع کرنا چاہیے۔ اگرچہ ان اقوال کو درست تسلیم کرنے کی صورت میں بھی موضوع زیر بحث پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ (۲) دیوان حسان بن ثابت، تحقیق ڈاکٹر ولید عرفات، دار صادر، بیروت، ۱۹۷۴ء، ج ۱، ص ۹۶۔ (۳) خطوط غالب، مرتبہ غلام رسول مہر، کتاب منزل، لاہور (مقدمۂ کتاب کی تاریخ ۱۹۵۱ء)، ص ۸۸۔ (۴) غالب بحیثیت محقق، مضمون قاضی عبدالودود مشمولہ نقد غالب، مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد، انجمن ترقی اردو علی گڑھ، ص ۵۰۴-۵۰۵۔ (۵) دیوان ناصر خسرو، نسخہ برقی، مرکز تحقیقات رایانہ ای قائمیہ اصفہان، ص ۲۶۔ (۶) حدیقۃ الحقیقہ، حکیم سنائی مطبع مرزا ابو طالب شیرازی، بمبئی، ۱۸۵۹ء، ص ۸۴۔ (۷) شرح دیوان اردوے غالب، سید علی حیدر نظم طباطبائی، مرتبہ ظفر احمد صدیقی، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۲۰۱۲ء، ص ۲۲۰، ۲۲۱۔ (۸) زبان اور قواعد، رشید حسن خاں، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۱۹۷۶ء، ص ۱۳۲۔ (۹) شرح طباطبائی: ۴۲۶۔ (۱۰) الذریعۃ الی تصانیف الشیعۃ، آغا بزرگ طہرانی، دار الاضواء، بیروت، نسخہ برقی، ج ۹-۴، ص ۱۰۔ (۱۱) زبان اور قواعد: ۱۳۳۔ (۱۲) ایضاً: ۱۳۵۔ (۱۳) نور اللغات، مولوی نور الحسن نیر، پریس پاٹا نالہ لکھنؤ، ۱۹۲۹ء، ج ۳، ص ۶۵۷۔ (۱۴) زبان اور قواعد: ۱۳۵۔ (۱۵) ایضاً: ۱۳۳۔ (۱۶) ملاحظہ ہوں فن قراءت اور تفسیر کی کتابیں، مثال کے طور پر: الکشف عن وجوہ القراءات السبع وعللہا وحججہا، مکی بن ابی طالب قیسی (ف ۴۳۷ھ)، تحقیق محی الدین رمضان،

مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت ۱۴۰۴ھ، ج ۱، ص ۱۱۱۔ التیسیر فی القراءات السبع، ابوعمرو الداني (ف ۴۴۴ھ)، دار الکتاب العربي، بیروت، ۱۴۰۴ھ، ص ۷۹۔ النشر فی القراءات العشر، شمس الدین ابن الجزری (ف ۸۳۳ھ)، المطبعۃ التجاریۃ الکبری، قاہرہ، ۱۹۴۰ء، ج ۱، ص ۴۱۴۔ البحر المحیط فی التفسیر، ابوحیان اندلسی (ف ۷۴۵ھ)، دار الفکر، بیروت ۱۴۲۰ھ، ج ۲، ص ۱۹۶۔ (۱۷) عبداللہ بن کثیر کے حالات کے لیے دیکھیے: سیر اعلام النبلاء، شمس الدین ذہبی (ف ۷۴۸ھ)، تحقیق شعیب الارنؤوط، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۴۱۰ھ، ج ۵، ص ۳۱۸۔ طبقات القراء، ذہبی، تحقیق احمد خاں، مرکز الملک فیصل، ریاض، ۱۴۲۷ھ، ج ۱، ص ۱۰۱۔ غایۃ النہایۃ فی طبقات القراء، ابن الجزری (ف ۸۳۳ھ) مرتبہ برجسٹراسر، قاہرہ، ج ۱، ص ۴۴۳۔ (۱۸) سیر اعلام النبلاء ۳: ۳۸۸، طبقات القراء ۱: ۶۵، غایۃ النہایۃ ۱: ۴۱۹۔ (۱۹) غایۃ النہایہ ۱: ۲۸۰؛ ۱: ۴۲۶؛ ۲: ۴۱۔ (۲۰) ایضاً ۱: ۱۶۶؛ ۲: ۶۵۔ (۲۱) مثال کے طور پر دیکھیے: کتاب سیبویہ (ف ۱۸۰ھ)، تحقیق عبدالسلام ہارون، قاہرہ، ۱۴۰۸ھ، ج ۳، ص ۵۴۱۔ المقتضب، ابوالعباس المبرد (ف ۲۸۵ھ)، تحقیق محمد عبدالخالق عضیمہ، عالم الکتب، بیروت، ج ۱، ص ۱۵۵۔ الاصول فی النحو، ابوبکر ابن السراج (ف ۳۱۶ھ)، تحقیق عبدالحسین الفتلی، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، ج ۳، ص ۳۹۹۔ النشر فی القراءات العشر ۱: ۳۶۰۔ (۲۲) مثلاً قطرب (ف ۲۰۶ھ)، ابوزید انصاري (ف ۲۱۵ھ)، اصمعی (ف ۲۱۶ھ)۔ دیکھیے: فہرست ابن الندیم، تحقیق ایمن فؤاد سید، مؤسسۃ الفرقان للتراث الاسلامی، لندن، ۱۴۳۰ھ، ج ۱، ص ۱۴۹، ۱۵۵، ۱۵۷۔ (۲۳) الکشف عن وجوہ القراءات السبع ۱: ۱۱۰-۱۱۱۔ (۲۴) لسان العرب، ابن منظور، دار صادر، بیروت، مادہ مرأ، ج ۱ ص ۱۵۶۔ (۲۵) شرح دیوان عمر بن ابی ربیعہ، تحقیق محمد محي الدین عبدالحمید، دار الاندلس، بیروت، ۱۴۰۳ھ، ص ۳۵۸۔ (۲۶) دیوان عبیداللہ بن قیس الرقیات، تحقیق محمد یوسف نجم، دار صادر، بیروت، ۱۳۷۸ھ، ص ۱۰۔ (۲۷) تہذیب اللغۃ، ابومنصور الازہری (ف ۳۷۰ھ) تحقیق محمد ابوالفضل ابراہیم وغیرہ، قاہرہ، ج ۱۱، ص ۴۱۸۔ (۲۸) دیوان حسان ۱: ۲۱۰۔ (۲۹) ایضاً ۱: ۴۳۵۔ (۳۰) الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ، ابن حجر عسقلانی، تحقیق علی البجاوی، دار الجیل، بیروت، ۱۴۱۲ھ، ج ۱، ص ۱۷۰، نیز دیکھیے مقدمۂ دیوان۔ (۳۱) شعر ایمن بن خریم الاسدی، جمع و تحقیق عبداللہ القتم، جامعۃ الکویت، ۱۴۲۵ھ، ص ۲۷۔ (۳۲) الاصابۃ ۶: ۴۹۱، الشعر والشعراء، ابن قتیبہ (ف ۲۷۶ھ) تحقیق احمد شاکر، دار المعارف، قاہرہ، ۱۹۸۲ء، ج ۱، ص ۳۲۹۔ الاعلام، خیرالدین زرکلی، دار العلم للملایین، بیروت، ۱۹۸۴ء، ج ۵، ص ۲۰۷۔ (۳۳) الوحشیات، ابوتمام (ف ۲۳۱ھ)، تحقیق عبدالعزیز المیمنی، دار المعارف،

قاہرہ، ۱۹۸۷ء، ص ۱۱۴۔ (۳۴) الاغانی، ابوالفرج الاصبہانی (ف ۳۵۶ھ)، دارالثقافۃ، بیروت ۱۴۰۱ھ، ج ۱۱، ص ۲۹۱۔ الاعلام ۲: ۱۳۳۔ (۳۵) الاغانی ۱۱: ۳۰۶۔ شعراء امویون، نوری حمودی قیسی، عالم الکتب، بیروت، ۱۴۰۵ھ، ص ۳۶۱۔ (۳۶) الاغانی ۱۳: ۲۶۰، الاعلام ۳: ۳۰۵۔ (۳۷) الاغانی ۱۳: ۲۶۶۔ (۳۸) جمل من انساب الاشراف، بلاذری (ف ۲۷۹)، دارالفکر، بیروت ۱۴۱۷ھ، ۴: ۳۰۵۔ الاعلام ۵: ۱۵۰۔ نیز دیکھیے مقدمۂ دیوان۔ (۳۹) جمل من انساب الاشراف ۵: ۱۱۳، شعر الاخضر اللہبی، جمع ودراسۃ ابراہیم بن سعد الحقیل، جامعۃ الملک سعود، ریاض ۱۴۳۳ھ، ص ۶۶۔ (۴۰) الاغانی ۷: ۴۔ الاعلام ۸: ۱۲۳۔ (۴۱) الاغانی ۷: ۵۷۔ دیوان الولید بن یزید، مرتبہ اطالوی مستشرق Cabrieli، دمشق ۱۹۳۷ء، ص ۴۲۔ (۴۲) جمل من انساب الاشراف ۸: ۳۳۰؛ ۱۳: ۴۷۔ (۴۳) الاغانی ۱۴: ۲۴۸۔ (۴۴) الاعلام ۷: ۱۹۲۔ (۴۵) الاغانی ۲۳: ۱۵۰، شعر الخوارج، جمع وتقدیم احسان عباس، دارالثقافۃ، بیروت، طبع دوم، ص ۲۲۵۔ (۴۶) حالات کے لیے دیکھیے: الاغانی ۷: ۲۲۴، الاعلام ۱: ۳۲۲۔ (۴۷) دیوان السید الحمیری، دار صادر، بیروت، سنہ ۱۹۹۹ء، ص ۱۷۷۔ (۴۸) دیوان ابی نواس، تحقیق ایوالڈ واغنر، بیروت، ۲۰۰۳ء، ج ۲، ص ۷۹۔ (۴۹) دیوان ابی تمام بشرح التبریزی، تحقیق محمد عبدہ عزام، دار المعارف، قاہرہ، ۱۹۶۴ء، ج ۳، ص ۳۳۷۔ (۵۰) ایضاً ۲: ۲۰۹۔ (۵۱) دیوان البحتری، تحقیق حسن کامل الصیرفی، دارالمعارف، قاہرہ، طبع سوم، ج ۴، ص ۲۲۹۱۔ (۵۲) ایضاً ۲: ۸۳۶۔ (۵۳) طبقات الحنابلۃ، ابن ابی یعلی (ف ۵۲۶ھ)، تحقیق عبدالرحمٰن العثیمین، ریاض، ۱۴۱۹ھ، ج ۳، ص ۱۳۳۔ نیز دیکھیے مقدمۂ دیوان۔ (۵۴) دیوان علی بن الجہم، تحقیق خلیل مردم بک، دار صادر، ۱۹۹۶ء، ص ۲۴۳۔ (۵۵) ایضاً: ۲۳۴۔ (۵۶) الاعلام ۱: ۴۴۔ (۵۷) دیوان ابراہیم بن عباس الصولی، مشمولہ الطرائف الأدبیۃ، تحقیق عبدالعزیز المیمنی، لجنۃ التالیف والترجمۃ والنشر، قاہرہ، ۱۹۳۷ء، ص ۱۷۹۔ (۵۸) الاعلام ۴: ۳۲۴، نیز دیکھیے مقدمۂ دیوان۔ (۵۹) دیوان الحمانی، تحقیق محمد حسین الاعرجی، دار صادر، بیروت، ۱۹۹۸ء، ص ۷۲۔ (۶۰) ایضاً: ۳۳۔ (۶۱) الاعلام ۲: ۸۸، نیز دیکھیے مقدمۂ دیوان۔ (۶۲) دیوان الامیر تمیم بن المعز لدین اللہ الفاطمی، تحقیق محمد حسن الاعظمی وغیرہ، دارالکتب المصریہ، قاہرہ، ۱۹۵۷ء، ص ۳۳۷۔ (۶۳) ایضاً: ۴۲۵۔ (۶۴) ایضاً: ۴۲۹۔ (۶۵) الاعلام ۱: ۳۱۶۔ (۶۶) دیوان الصاحب بن عباد، تحقیق محمد حسن آل یاسین، دارالقلم، بیروت، طبع دوم، ص ۴۲۔

بریلی میں اردو شاعری کا ارتقاء
(۱۷۴۹ء تا ۱۹۴۹ء)

سید لطیف حسین ادیب

(۲)

کرامت علی خاں شہیدیؔ: شہیدیؔ کے مشہور زمانہ قصیدے کا یہ شعر ضرب المثل ہے۔

تمنا ہے درختوں پر ترے روضہ کے جا بیٹھے
قفس جس وقت ٹوٹے طائر روح مقید کا

شہیدیؔ نے یہ قصیدہ سرزمین بریلی میں ۱۸۴۰ء میں تحریر کیا اور اس کے بعد وہ حج بیت اللہ شریف کے لیے روانہ ہوگیا۔ اس قصیدے کی زمین میں نہ صرف قصائد تحریر ہوئے اس کی مقبولیت نے نعت گوئی کا رجحان پیدا کیا۔ خود بریلی میں اس قصیدے کو نعت گوئی کا محرک کہا جا سکتا ہے۔ اس قصیدے سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اردو نعت گوئی بہ صد بلاغت اور شکوہ وشوکت نعت گوئی کے ابتدائی دور میں ممکن تھی۔ دراصل اس قصیدے نے بریلی کے نعت گویان کو حوصلہ دیا اور ان کی ہمت بندھی کہ وہ نعت میں شاعری بلاغت اور صنائع وبدائع کے ساتھ کر سکتے ہیں۔

بریلی میں مراثی نے رواج نہیں پایا۔ نوابین روہیلہ روہیلہ پٹھان اور پسران علی محمد خاں سنی العقیدہ تھے۔ مرثیہ۔ سلام۔ نوحہ جو واقعات کربلا سے وابستہ ہیں اور جنہیں بطور خاص ایام عزا میں پڑھا جاتا ہے بریلی کے عہد روہیلہ میں مروج نہیں تھے۔ بریلی میں شیعہ تحریک کا آغاز آصف الدولہ کے عہد حکومت (۱۷۷۵ء تا ۱۷۹۷ء) میں ہوا۔ شیعہ امام باڑہ اور شیعہ مسجد کی تعمیر ہوئی شیعہ تحریک ۱۸۰۱ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا بریلی پر اقتدار قائم ہونے سے کمزور پڑ گئی۔ لہٰذا

---

۷۳ پھول والان، بریلی (یوپی) ۲۴۳۰۰۳۔

اس وقت واقعات کربلا مثنوی کی صنف میں قلم بند ہوئے اور وہ سبھی برسبیل و بالواسطہ۔ ایسے کام میں میر غلام علی عشرتؔ کی مثنوی ریاض الحسینین اور ذوالفقار علی صفاؔ کی زاد الآخرت (مطبوعہ مدراس ۱۸۰۳ء) کا حوالہ دیا جاسکتا ہے۔ زاد الآخرت میں ذکر شہادتیں پر چار ہزار ابیات ہیں۔

واقعہ کربلا کے علاوہ ایک مشہور مرثیہ امیر الدین آزادؔ کا تحریر کردہ ہے۔ آزاد نے یہ مرثیہ رحیم بخش دری باف کے پھانسی کی سزا پانے پر تحریر کیا۔ رحیم بخش نے ۱۸۳۷ء میں چودھری بسنت رائے کو فرقہ وارانہ منافرت کی بنا پر قتل کر دیا تھا۔

ان مراثی یا ذکر شہادتین پر مثنویات کے علاوہ جو مناقب ائمہ اطہار کی مدح میں شعرائے بریلی کے دواوین میں ملتے ہیں، وہ بہر حال مرثیہ نہیں ہیں۔

اسی عہد میں دو واسوخت ملتے ہیں۔ ایک واسوخت امیر الدین آزادؔ کا اور ایک الف خاں جولاںؔ (م ۱۸۷۴ء) تلمیذ آتشؔ (م ۱۸۴۶ء) کا۔ یہ دونوں واسوخت فدا علی کے مجموعہ واسوخت مسمیٰ شعلۂ جوالہ، مطبوعہ ۱۸۶۸ء، میں شامل ہیں۔ دونوں واسوخت معیاری ہیں۔

بریلی میں ہجو نگاری کا سلسلہ نعیم اللہ نعیمؔ (م ۱۸۰۸ء) نے سوداؔ کی ہجو لکھ کر شروع کیا۔ اس کے بعد امیر الدین آزادؔ نے ایک ہجویہ مثنوی مسمیٰ نورباف تحریر کی جو بیانیہ اسلوب میں کافی دلچسپ ہے۔

اس طرح زوال روہیل کھنڈ کے بعد بریلی کی شعرو شاعری کو جو دھکا لگا اور جس کا اثر ساٹھ برس سے کچھ اوپر تک قائم رہا، اس میں سخن سنجی بہر طور جاری رہی۔ ۱۸۵۰ء تک زبان شعرائے بریلی قدامت سے بالکل آزاد ہوگئی۔ اساتذہ دہلی کے اثرات بریلی میں آنا شروع ہوئے۔ اساتذۂ لکھنؤ کی گرفت مضبوط ہوئی۔ شعرائے بریلی نے دونوں طرز سخن کی طرف نگاہ اٹھائی، ان کو دیکھا اور پرکھا اور اپنے رجحان طبع کے مطابق استفادہ کیا۔ زمیندار اور انگریز طبقے نے شعراء کو نوازنا شروع کیا جس سے بہتر مستقبل کی بشارت ملنے لگی۔

شعرائے بریلی مشکل سے ہی اپنے پاؤں پر کھڑے ہوئے تھے کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ کھڑا ہوگیا جس میں شہر بریلی پوری طرح ملوث ہوا۔ نواب حافظ رحمت خاں کے نبیرہ خاں بہادر خاں المتخلص بہ مصروفؔ تلمیذ قلندر بخش جرأتؔ نے انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ بریلی میں جنگ آزادی کا آغاز ۳۱ رمئی ۱۸۵۷ء کو ہوا اور اختتام ۵ رمئی ۱۸۵۸ء کو جب انگریزوں نے بریلی پر

حملہ کر کے خان بہادر خاں کو شکست دی۔ اس کے بعد کمپنی کی فوج نے بریلی میں غیر معمولی بربریت کا مظاہرہ کیا۔ بریلی میں بھگدڑ مچی اور لوگ پناہ حاصل کرنے کے لیے شہر چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ تین دن عام لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا بازار گرم رہا۔ اس ظلم میں انگریز نواز طبقہ شامل تھا۔ مخبر بھی مقامی لوگ تھے۔ گولی مار کر ہلاک کرنے اور پھانسی پر لٹکانے کے واقعات روزانہ کا معمول بن گئے۔ حریت پسندوں کو ہلاک کر کے انگریزوں نے ان کی جائداد ضبط کی اور بعد کو اپنے مددگاروں کو بطور انعام عطا کر دی۔ معمولی لوگ صاحب حیثیت بن گئے اور ہمیشہ کے لیے انگریز کے وفادار بھی۔ نواب خان بہادر خاں اور مرزا عباس بیگ عباسؔ و نادرؔ کو پھانسی لگی۔ مفتی سید احمد خاں سیدؔ تلمیذ غالبؔ کو جزائر انڈمان بھیجا گیا۔ عام لوگوں میں پھانسی پانے والوں کا شمار نہیں۔ پورا شہر بریلی تباہ ہو گیا۔ ۱۸۶۰ء کے بعد لوگوں میں اعتماد بحال ہونا شروع ہوا۔ شہر شہر بھاگے ہوئے شعرائے بریلی واپس آئے۔ مقامی شعراء نے زندگی کی سانس لی۔ خاندان مولویان۔ خاندان قاضیان۔ خاندان مفتیان۔ خاندان کمبوہان اور خاندان روہیلہ میں دوبارہ محفل سخن آراستہ ہوئی۔ بریلی کے انگریز حکام نے سماجی، شہری اور ادبی فروغ کی کوششوں میں مدد کی۔ شہر میں انگریزی تعلیم کے لیے اسکول کھلے، گنج اور بازار بنے۔ روہیل کھنڈ لٹریری سوسائٹی بریلی نے شاعروں اور طباعت کتب کا انتظام کیا۔ مذکورہ سوسائٹی نے اپنا پریس بھی قائم کیا۔ سوسائٹی کا کاروبار کتب خانے کی عمارت میں ہوتا جو ۱۸۵۵ء میں تعمیر ہوئی تھی۔ سوسائٹی کے ممبران عمائد شہر تھے۔ لٹریری سوسائٹی اور اس کے پریس نے شعراء کی صفوں میں اعتماد بحال کیا اور مشاعروں کے ذریعہ شعراء کو یکجا کیا۔

اس وقت بھی جس شاعر نے سب سے زیادہ شعرائے بریلی کو سہارا دیا وہ امیر الدین آزادؔ ہی تھا۔ اس کے تلامذہ مذکورہ بالا پانچوں خاندانوں میں موجود تھے اور انھوں نے اپنی مساعی سے بریلی میں دوبارہ محفل سخن سجا دی۔ امن و سلامتی کے بحال ہونے کے بعد شعرائے بریلی کا اساتذۂ بیرونجات سے بھی تعلق پیدا ہوا۔ اب جو محفل سخن آراستہ ہوئی اس میں تین طرح کے شعراء تھے: ۱- قاضی عبدالملک ممتازؔ اور امیر الدین آزادؔ کے تلامذہ۔ ۲- شعرائے دہلی کے تلامذہ۔ ۳- شعرائے لکھنؤ کے تلامذہ۔ قسم اول کے تلامذہ کثیر تعداد میں تھے جن میں سے بعض شعرائے بیرونجات کے بھی شاگرد ہوئے۔ مثلاً نیاز احمد خاں ہوشؔ نے خلیفہ امیر الدین آزادؔ کی انگلی پکڑ کر

چلنا شروع کیا لیکن جب وہ ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد لکھنؤ گیا، اس نے مظفر علی اسیرؔ (م ۱۸۸۲) سے تجدید تلمذ کی۔ قسم دوم کے شعراء کی تعداد کم ہے۔ شماریاتی اندازے کے مطابق غالبؔ کے چھ۔ مومنؔ کے تین۔ صدر الدین آزردہؔ کا ایک اور داغؔ کے پانچ تلامذہ ملتے ہیں۔ قسم سوم میں ان شعراء کا ازدحام ہے جس میں اکثریت ان شعراء کی ہے جو اساتذہ لکھنؤ سے وابستہ ہوئے۔ اس وقت توسیع سخن کے ساتھ مذکورہ بالا پانچوں خاندان کے شعراء بھی مخصوص طرز کے حامل بن گئے۔ خاندان کمبوہاں اور خاندان مولویاں کے بیشتر شعراء امیر الدین آزادؔ اور اس کے تلامذہ سے وابستہ تھے۔ قاضی عبدالملک ممتازؔ کا اثر خاندان روہیلہ پر تھا۔ بریلی میں انیسویں صدی عیسوی کا بے مثل شاعر نواب عبدالعزیز خاں عزیزؔ (م ۱۸۹۱ء) اس کا ہی شاگرد تھا۔ خاندان روہیلہ کے شعراء اساتذہ بریلی کے علاوہ اساتذہ لکھنؤ سے بھی وابستہ ہوئے۔ خاندان مفتیان اور خاندان قاضیان نے نسبت غالبؔ پر فخر کیا۔ خاندان علمائے اہل سنت والجماعت (بریلوی مکتب فکر) میں حسن رضا خاں حسنؔ نے طرز داغؔ کی ترویج کی اور اس خاندان کے شعراء نے نعت گوئی کو علو بخشا۔ مختصر یہ کہ بریلی میں اردو شاعری جب بیسویں صدی عیسوی میں داخل ہوئی تو مذکورہ خاندانوں کے شعراء، ان خیل در خیل شعراء کے ساتھ جو ان سے وابستہ تھے، اپنے دہلوی۔ بریلوی اور لکھنوی امتیازات سخن کے ساتھ داخل ہوئی۔

امیر الدین آزاد کے تلامذہ میں محسن علی خاں جوشؔ (م ۱۸۶۳ء) جس کا تعلق خاندان کمبوہان سے تھا، ایک عمدہ غزل گو تھا۔ اس نے اپنی شاعری کے متعلق تحریر کیا ؎

اہل دل سن کے کیوں نہ وجد کریں
حال ہیں میرے شعر قال نہیں

اس نے مضامین زلف و گیسو اور سیج و وصل سے اجتناب کیا۔ محسوسات اور واردات قلب کو نظم کیا اور زبان بھی صاف ستھری استعمال کی۔ ہر چند اس کا دیوان ۸۸-۱۸۸۹ء میں شائع ہو گیا تھا، اس کو وہ شہرت نہیں ملی جس کا وہ مستحق تھا۔ یہ مشہور شعر اسی کا ہی ہے ؎

خاک ہو جا صورتِ سیماب جل کر عشق میں
چاہتا ہے مرتبہ اے دل اگر اکسیر کا

امیر الدین آزاؔد کے تلامذہ میں خاندان روہیلہ کا شاعر نواب نیاز احمد خاں ہوؔش نہایت ذی علم اور قادر الکلام تھا۔ اس کو اردو شاعری کی ہر صنف پر قدرت حاصل تھی۔ اس کی غزلیات میں تلاش مضمون، بلندی تخیل اور شکوہ زبان کی خوبیاں ملتی ہیں۔ الفاظ کی بندش اور اسلوب کی روانی مذکورہ خصوصیات پر مستزاد تھی۔ وہ اپنے طرز غزل گوئی میں منفرد سا نظر آتا ہے۔ اس کے مندرجہ ذیل مشہور شعر سے اس کی غزل کے طرز کا اندازہ ہوسکتا ہے ؎

چلنے میں جب وہ دوہرے ہوے آئی یہ صدا نخوت نے لو ہلا ل کیا آفتاب کو

اس کو شاعروں اور گلدستوں سے دلچسپی تھی۔ اس کے تلامذہ بھی کثرت سے تھے۔ اس نے بریلی میں شاعری کی اشاعت کی۔ وہ اپنی ذات میں خود بھی انجمن سا لگتا تھا۔ اس کا دیوان ۱۸۹۴ء میں اشاعت پذیر ہوا۔

قاضی عبدالملک ممتاؔز کا شاگرد اور خاندان روہیلہ کا مایہ ناز فرزند نواب عبدالعزیز خاں عزؔیز (م ۱۸۹۱ء) بے مثل صلاحیتوں کا شاعر تھا۔ اس کی غزل میں اس کی اعلیٰ علمیت کی وجہ سے مضامین نو اور تخیل طرازی کی بھرمار ہے۔ لیکن اس کو مشاعرے کے علاوہ مجرے سے بھی دلچسپی تھی۔ ارباب نشاط سے وابستہ معاملات، واردات اور رموز اس کا اوڑھنا بچھونا تھے۔ لہٰذا ایک ہی وقت میں جہاں وہ ہیرا تراش کر نگ جڑتا وہاں وہ ارباب نشاط کے حسن اعضا اور واردات کو بھی نظم کرتا۔ اس کا کمال اس کی باریک بینی میں پوشیدہ ہے۔ اس کا تغزل نازک خیالی اور نازک بیانی سے عبارت ہے۔ مندرجہ ذیل چند اشعار سے اس کے طرز غزل کا اندازہ ہوسکتا ہے ؎

ابرو میں خم، کمر میں لچک، زلف میں شکن وہ کون سی جگہ ہے جہاں بانکپن نہیں

باعث پردہ دری گریۂ بے باک ہوا پردۂ چشم بھی دامن کی طرح چاک ہوا

راستے اور بھی ہیں ملک عدم کے لیکن تیغ کے گھاٹ اتر جانے میں آسانی ہے

گردن کے دکھانے کو صفا پھیر لیا منہ کیا اس نے تغافل کو ملایا ہے ادا میں

عشاق زلف زندۂ جاوید کیوں نہ ہوں ہاتھ آگیا ہے سلسلہ عمر دراز کا

دل ہو خستہ تو اجابت ہو دعا سے پہلے ٹوٹے کاسہ میں ملے بھیک صدا سے پہلے

قیامت ہیں یہ در پردہ نگاہیں غضب کی چیز ہے شوخی حیا میں

صاف انکار کی تمہید نہ ڈالی ہوتی عذر ہی کر کے کوئی بات بنالی ہوتی

شراب تند کو کرتی ہے برف سے ٹھنڈا جھپک حیا کی جو ہے شوخیٔ نگاہ کے ساتھ

غلام غوث بے خبرؔ (م ۱۹۰۴ء) نے دیوان عزیزؔ کی تقریظ میں تحریر کیا:

''جو کچھ کہا ہے ایسا کہا ہے کہ کوئی کہہ نہیں سکتا ہے۔ اسے دیکھ کے سخن شناشوں کو حیرت ہے کہ جن مضامین تک خاقانیؔ اور انوریؔ کے دست فکر نہ پہنچے وہ ان کے ہاتھ کہاں سے آئے اور پھر اس کثرت سے۔ معنی فہموں کو حیرت ہے''۔ (ص ۲۵۸)

اس کے تلامذہ بھی کثرت سے تھے جنھوں نے بریلی میں شاعری کی اشاعت کی۔

اساتذۂ دہلی کے شعرائے بریلی پر اثرات کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ بریلی میں غالبؔ کے چھ شاگرد تھے جن کے اسماء ہیں: مفتی سلطان حسن خاں احسنؔ۔ غلام بسم اللہ بسملؔ۔ محمد حسین صاحبؔ۔ قاضی عبدالجمیل جنونؔ۔ مفتی سید احمد خاں سیدؔ اور قاضی عبدالرحمٰن وحشیؔ۔ ان میں مفتی سلطان حسن خاں احسنؔ (م ۱۸۷۲ء) سے سلسلہ غالبؔ ان کی وفات کے بعد ان کی اولاد نے اس طرح قائم رکھا کہ انہوں نے غلام بسمل اللہ بسملؔ (م ۱۸۹۸ء) کی شاگردی اختیار کی اور اس کی وفات کے بعد مفتی عماد الحسن محوؔ (م ۱۹۲۶ء) سے وابستہ ہوئے۔ خاندان مفتیان نے ہمیشہ نسبت غالبؔ پر فخر کیا اور غزل گوئی میں اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا۔ خاندان مفتیان کا آخری چراغ مفتی صابر حسن پیشواؔ عثمانی ۱۹۷۵ء میں کراچی میں فوت ہوا۔ قاضی عبدالجمیل جنونؔ بھی خاندان مفتیان کا فرد تھا لیکن عہدۂ قضا پر متمکن ہونے کی وجہ سے مفتیان کی یہ شاخ قاضی کے سابقے سے مشہور ہوئی۔ قاضی محمد خلیل حیرانؔ جو قاضی عبدالجمیل جنونؔ کا پسر تھا، غالبؔ کے کسی شاگرد سے منسلک نہیں ہوا اور اس طرح قاضیان بریلی میں سلسلہ غالبؔ ختم ہو گیا۔ ان کے علاوہ جو شعراء غالبؔ سے تلمذ رکھتے تھے۔ زیادہ مشہور نہیں ہوئے۔ ان کی بیاضیں بھی ناپید ہو گئیں۔

بریلی میں مومن خاں مومنؔ (م ۱۲۶۸ھ/۵۱-۱۸۵۲ء) کے تین شاگرد تھے۔ جن کے اسماء ہیں: غفورالدین تسلیمؔ۔ مرزا مہدی حسین حناؔ اور عظمت اللہ عظمتؔ۔ ان میں صرف غفورالدین تسلیمؔ مشہور ہوا۔ اس کی غزل میں شوخی اور بانکپن ہے ؎

دیر کس کو ہو گئی تم کو ہے کس کا انتظار کر رہے ہو مجھ سے باتیں منھ سوے در اوٹھا

شوخیوں نے خواب میں شاید تجھے چھیڑا کہ تو سویا ہنستا بولتا بدلے ہوئے تیور اوٹھا

اس نے پابندی سے مشاعرے کرائے اور مشاعرے کی غزلیات گلدستۂ نشو ونما بریلی میں شائع کرائیں جس کا وہ سرپرست تھا۔

بریلی میں نواب مرزا داغؔ کے پانچ تلامذہ تھے جن کے اسماء ہیں: حسن رضا خاں حسنؔ۔ سرفراز علی خاں رفعتؔ۔ عبدالکریم عروجؔ اور ہادی حسین بیگ فرخیؔ۔ ان میں حسنؔ نے بہت شہرت پائی۔ اس کی ایک غزل جس کا مطلع ہے ؎

حسن جب مقتل کی جانب تیغ براں لے چلا عشق اپنے مجرموں کو پا بجولاں لے چلا

پورے ملک میں مشہور ہوئی۔ خاندان علمائے بریلی سے نسبت رکھنے کی وجہ سے اس کی ذہنی سطح اپنے استاذ سے بلند تھی۔ اس نے داغؔ کے تغزل کو طیب کیا۔ اس کی وضاحت اور قادرالکلامی پر حیرت ہوتی ہے۔ اس کی غزل کے دو چار اشعار مندرجہ ذیل ہیں ؎

کچھ حسینوں کی محبت بھی بری ہوتی ہے کچھ یہ بے چین طبیعت بھی بری ہوتی ہے

آپ کی ضد نے مجھے اور پلائی حضرت شیخ جی اتنی نصیحت بھی بری ہوتی ہے

قیس کے حال کو سن سن کے جگر پھٹتا ہے ساتھ کھیلے کی محبت بھی بری ہوتی ہے

عمر روتے ہی کٹی جان پہ کھیلے ہی بنی ہم ہنسی کھیل سمجھتے تھے محبت ان کی

کیا پاؤ گے تم ہم سے فقیروں کو ستا کر بندے کو ذرا خوف بھی لازم ہے خدا سے

عشق صد گونہ الم حسن ہزاراں غفلت کیسے بھولوں میں انہیں وہ مجھے کیا یاد کریں

حسنؔ اور اس کے تلامذہ نے غزل کی اس خارجیت کو ختم کرنے میں سہارا دیا جو اساتذہ لکھنؤ کے تلامذہ بریلی کے ذریعہ مقبول ہوئی تھی۔ حسنؔ کی غزل کے اثرات شعرائے بریلی پر تقریباً چالیس برس تک قائم رہے اور اس کا حلقۂ شعراء اپنی فصاحت اور زبان دانی کی وجہ سے اپنی پہچان بنانے میں کامیاب ہوا۔

شعرائے دہلی کے بعد بریلی کے شعراء پر شعرائے لکھنؤ کے اثرات کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ شعرائے بریلی کا لکھنؤ کا جانا اور قیام کرنا معمولات میں سے تھا۔ شاید اس کا سبب یہ بھی تھا کہ بریلی کے بعض شعراء لکھنؤ میں آباد ہوئے اور رفتہ رفتہ ان کے خاندان نے افتخار حاصل

کیا جن سے شعرائے بریلی کو تقرب میسر ہوا اور انہوں نے وہاں کے مشاعروں میں شرکت کی۔ بعض اساتذہ لکھنؤ بھی کچھ وقت کے لیے بریلی میں مقیم ہوئے اور انہوں نے اپنا کلام اپنے میزبانوں کے مشاعرے میں سنایا۔ ۱۸۴۰ء سے لگ بھگ ۱۹۰۰ء تک شعرائے بریلی جن اساتذۂ لکھنؤ کے شاگرد ہوئے، ان کے اسماء یہ ہیں: محمد اسماعیل سائف۔ سید محمد کاظم جاوید۔ گوری شنکر مسرتؔ۔ بھگوان داس ہندیؔ۔ خیرالدین یاس۔ حیدر علی آتشؔ۔ عاشور علی خاں عاشورؔ۔ مظفر علی اسیرؔ۔ کلب حسین نادرؔ۔ اوسط علی رشکؔ۔ خواجہ محمد وزیرؔ۔ جعفر حسین کاشفؔ۔ امیرؔ مینائی وغیرہ۔

۱۸۶۰ء اور ۱۹۰۰ء کے مابین بریلی میں لکھنوی طرز سخن اس قدر مقبول ہوا کہ ان منفرد شعراء کو چھوڑ کر جو اساتذہ دہلی کا اتباع کر رہے تھے یا جنہوں نے اپنی راہ خود متعین کی تھی، کثیر تعداد میں شعراء خارجیت کے ہی دلدادہ تھے اور بریلی میں ارباب نشاط کی آمد اور امراء میں ان کی پذیرائی کی وجہ سے شاعری کے اس طرز کو مزید تقویت ملی۔ اس عہد کی شاعری سے متاثر ہو کر برج موہن لال خمارؔ بریلوی نے کہا تھا ؎

لکھنؤ کیوں نہ بریلی کو کہیں ان روزوں
اب تو سرسبز یہاں باغ سخن دیکھتے ہیں

اس عہد کے ایسے اساتذہ بریلی کے اشعار جن پر لکھنوی طرز سخن غالب ہے بطور نمونہ مندرجہ ذیل ہیں ؎

غضب اس لب پہ مسی کی دھڑی ہے
چھپائے منہ خجل سوسن کھڑی ہے
حضور احمد خاں آثمؔ

وصل کا اقرار ثابت ہوگیا اس بات سے
تھا اگر انکار تکرار نفی کا ہے کو تھی
باقر حسین باقرؔ

دید کے قابل ہے رحم ان کا کہ وقت نزع وہ
پانی ٹپکاتے ہیں حلق میں وہ مری تلوار کا
رحمت علی جنوںؔ

تھیں سگِ دلدار کے کھانے کو میری ہڈیاں
تیرا حصہ اس میں بتلا اے ہما کیوں کر ہوا
احمد حسن خاں جوشؔ

ٹھنڈے بہت پڑے ہیں تڑپتے ہیں بے شمار
کچھ بھی خبر حضور کو ہے زیرِ بام کی
محمد اسماعیل خاں ذبیح

روتے ہیں اپنے حالِ شکستہ پہ صبح تک
منہ ڈھانکتے ہیں دامنِ چاک سحر سے ہم
ہادی حسن رسوا

دریائے حسن اور بھی دو ہاتھ بڑھ گیا
انگڑائی اس نے نشے میں جو لی اٹھا کے ہاتھ
ظفریاب خاں راسخ

میری طرح کسی پہ تمہارا جو آئے دل
سینے پہ ہاتھ رکھ کے کہو ہائے ہائے دل
دھنپت رائے راز

ہے فضیلت مجھے اس زلف کے دیوانوں پر
جائے دستار مرے سر پہ ہیں زنجیر کے پیچ
مکھن لال شوق

نامراد ایسا بھی اٹھا ہے زمانے سے کوئی
حسرتوں کا تربت صادق پہ میلا کیوں نہ ہو
صادق علی صادق

صیاد مرغ دل مرا نازک ہے اس قدر
زنجیر بوئے گل میں گرفتار ہوگیا
طالب علی خاں طالب

پیتا نہیں شراب کبھی بے وضو کیے
قالب میں میرے روح کسی پارسا کی ہے
عباس بیگ نادر

گیسوؤں کو وصل کی شب منہ پہ تم آنے تو دو
شرط بدتا ہوں قیامت تک سحر ہوتی نہیں
〃 〃

ظالم کی رسی ہوتی نہیں ہے کبھی دراز
برعکس اس کے حال ہے زلف دراز کا
عبدالعزیز خاں عزیز

قیامت پر قیامت آگئی دوزخ نے منہ ڈھانکا
جو دیکھا دبدبہ میرے جنونِ فتنہ ساماں کا
مہربان علی فرحاں

ذکر کیا آیا ہمارے ہجر کی تحریر کا

مدتوں تک کلک رویا منشی تقدیر کا	؍؍ ؍؍
گڑ گیا شرم سے سر و لبِ جو تا بہ کمر	
کبھی گلشن میں جو وہ رشکِ صنوبر آیا	حسین علی خاں ناصؔر
دلِ مضطر پہ مرے دوہری بلا نازل تھی	
موت آئی نہ شب ہجر نہ دلبر آیا	سید رسول شاہ کلیؔم
روز کہتا تھا میں مرتا ہوں نہ مانا تو نے	
آج لے دیکھ لیا اب تجھے باور آیا	لطافت حسین خاں لطیفؔ
پاؤں پھیلائے ترے زلف کے سودائی نے	
لے کے حداد جو زنجیر و سلاسل آیا	محسن علی محسؔن
ضعف سے عالم ہوا یہ مجھ جگر افگار کا	
مل گیا تارِ کفن سے تار جسمِ زار کا	عنایت نبی نالاؔں
پھونکا ہے سوزِ ہجر نے اس ترک مست کے	
اب صید کیوں کروں نہ میں مرغِ کباب کو	نیاز احمد خاں ہوشؔ
منتیں کرنا شب وصل بلائیں لینا	
خاص مطلب کے لیے بات نہ کیا ہوتی ہے	کنج بہاری لال یکتاؔ

جس طرح مفتیان نے طرز غالب میں اپنی طباعی سے اپنا رنگ بھرا۔ جس طرح عبدالعزیز خاں عزیؔز نے خارجی نقش و نگار کو نازک تر بنایا اور اس دلربائی کو اپنی غزل میں سمویا جو انہیں ارباب نشاط سے خلوت و جلوت میں منکشف ہوئی اور ان کی غزل ممیّز و ممتاز ہونے میں کامیاب ہوئی۔ اسی طرح شعرائے بریلی کے ہجوم میں سید مہربان علی فرحاںؔ تلمیذ آتشؔ لکھنوی ایک ایسا منفرد شاعر تھا جس نے لکھنوی طرز سخن کو تمکنت بخشی، تموبہ کو خالص سونا بنایا۔ اس کی شاعری کا آغاز آتشؔ و ناسخؔ کے زیر سایہ ہوا۔ اس نے لکھا ہے ؎

فرحاںؔ نہ کیسے آتشؔ و ناسخؔ ہوں باغ باغ
بے مثل دیکھتے ہیں ہمارے سخن کا رنگ

فرحاںؔ مرے اشعار سے خوش ہوتے تھے ناسخؔ
دیتے تھے عجب لطف سے دادِ سخن آتشؔ

اس نے دو دواوین تیار کیے جو طبع نہیں ہوئے، تاہم محفوظ ہیں۔ اس کے طرزِ سخن کا اندازہ مندرجہ ذیل اشعار سے ہوتا ہے ؂

محبت دل کی مشہور جہاں ہے یہ دریا بند کوزے میں رواں ہے
ہے تصور کسی مہوش کی ہم آغوش کا دونوں ہاتھوں کو جدا آٹھ پہر رکھتے ہیں
اجڑ گیا کوئی گلشن طیورِ آزردہ چمن چمن لیے پھرتے ہیں آشیاں سر پر
بتِ کافر تری آنکھیں ہیں کہ اک جادو ہیں بن گیا دیکھ کے ایک ایک ہرن پتھر کا

غزل کی کافرادائی میں تصوف کا پٹ بھی شامل ہے۔ اس عہد کے ہر شاعر کی غزلیات میں دو ایک شعر ایسے ضرور مل جاتے ہیں جن میں بے ثباتیِ عالم، وحدت الوجود وغیرہ کے مضامین شامل ہیں لیکن ایسا شاعر جو عملاً صوفی ہو، مشاہدہ باطنی کا خوگر ہو سید حسین سیدؔ (م ۱۸۹۳ء) تھا۔ اس کا مجموعہ کلام مسمّٰی مرغوب دل ۱۸۸۲ء میں طبع ہوا لیکن اس کے اشعار میں عشق کی وہ حرارت اور فنائیت نہیں ملتی جو شاہ نیاز احمد نیازؔ کی غزلیات کا خاصہ ہے۔ تاہم اس عہد کے غزل گویان کے مجمع میں اس کی پہچان ایک صوفی شاعر کی حیثیت سے ہو جاتی ہے۔ اس کا مندرجہ ذیل شعر مشہور ہوا ؂

ہم عشق ہیں ہر ایک کے دل میں ہیں سمائے
گو خاص ہیں لیکن ہے گذر عام ہمارا

انیسویں صدی عیسوی میں بریلی میں غزل کا جائزہ لینے سے معلوم ہوا کہ ۱۸۶۰ء کے بعد غزل عام و خاص میں مروج ہوئی، اس نے اسالیب اختیار کیے اور نیاز احمد خاں ہوشؔ۔ عبدالعزیز خاں عزیزؔ۔ مہربان علی فرحاںؔ۔ قاضی عبدالجمیل جنوںؔ اور حسن رضا خاں حسنؔ نے اپنے اپنے طرزِ سخن سے نئی جہت اور نئی سمت دکھائی۔ کسی شاعر نے صحیح کہا تھا ؂

لکھنؤ شرق غرب دہلی ہے
دونوں شہروں کا دل بریلی ہے

بریلی کی تاریخ شاعری میں انیسویں صدی عیسوی کے آخری ساٹھ برس نعت گوئی کے۔

آغاز اور عروج کا عہد ہے۔اس وقت کثیر تعداد میں نعت گو تھے۔ابتدا میں نعت گویان نے پاس شرع کی وجہ سے محتاط رویہ اختیار کیا جس کا نمونہ لطف علی خاں لطفؔ کی نعتیہ شاعری ہے۔لیکن رفتہ رفتہ نعت گویان نے ان صنفی تقاضوں کو بھی پورا کرنا شروع کیا جس صنف میں نعت تحریر کی جاتی تھی۔اس طرح نعت گوئی میں فن شاعری کی چمک دمک بھی پیدا ہوئی۔اسی زمانے میں نعتیہ مشاعرے رائج ہوئے اور نعتیہ گلدستے شائع ہوئے۔نعت بریلی کے ہر گلی کوچے میں مقبول ہوگئی۔

وہ شعرائے بریلی جنھوں نے انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں نعت گوئی میں شہرت حاصل کی ان کے اسماء یہ ہیں : نواب حیدر حسین خاں حیدرؔ۔عبدالرزاق خاں رزاقؔ (م ۱۸۸۲ء)۔لطف علی خاں لطفؔ (م ۱۸۶۹ء)۔سید فضل غوث ساقیؔ (م ۱۸۹۰ء)۔سید احسان علی احسنؔ۔سید عبدالوحید واعظ۔ناصر الدین احمد ناصرؔ (م ۱۹۰۸ء)۔حسن رضا حسن خاںؔ (م ۱۹۰۸ء) نیاز احمد خاں ہوشؔ (م ۱۸۹۲ء)۔سید ہدایت علی ہدایت اور مولوی احمد رضا خاں رضا (م ۱۹۲۱ء)۔ یہ نعت گویان صاحب دواوین نعت ہیں۔حیدرؔ اور ہوشؔ نے مولود نامے تحریر کیے۔نعت کو ہر صنف سخن میں تحریر کیا۔نعت کو ہر اسلوب میں نظم کیا۔ان نعت گویان کے ذریعہ نعت کو ادبی حیثیت ملی۔ ان نعت گویان میں حیدرؔ۔ساقیؔ اور ناصرؔ صوفی اور ولی اللہ تھے۔ان کی نعت میں تصوف کی رمزیت ملتی ہے۔یہ شعر حیدر حسین خاں حیدرؔ کا ہے ؎

محمدؐ سرِّ قدرت ہے کوئی رمز اس کی کیا جانے
شریعت میں تو بندہ ہے حقیقت میں خدا جانے

رضاؔ اور حسنؔ عالم دین تھے اور عشق رسولؐ میں مقام فنائیت پر۔ان کی نعتوں میں، قصائد، مثنویات اور مناقب میں بے حد شیفتگی ہے۔دیگر شعراء روایت نعت کے اعلیٰ شاعر تھے۔ اردو نعت کے بریلی میں ارتقائی مطالعے کے پیش نظر جس شاعر نے نعت کو گھر گھر پہنچایا اور نعت کو غزل کی سی مقبولیت عطا کی، وہ حسن رضا خاں حسنؔ تھا۔اس کی نعت آج بھی مقبول ہے۔اس کا نعتیہ دیوان مسمّٰی ذوق نعت دو درجن سے زائد بار طبع ہو چکا ہے۔اس کی نعتیں اور سلام آج بھی پورے ذوق وشوق کے ساتھ ہندو پاک کی محافل مولود میں پڑھے جاتے ہیں۔

انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں بریلی میں قصیدہ نگاری کو فروغ ملا۔اس عہد

میں قدماء کے مقابلے میں زیادہ قصائد لکھے گئے۔ محسن علی خاں جوشؔ (م۱۸۶۳ء) کا نعتیہ قصیدہ موسومہ بہ نعت احمد بہت مشہور ہوا۔ شیوارام جوہرؔ کا فارسی قصیدہ جواہر الترکیب ۱۸۲۰ء میں تالیف ہوا لیکن اس کی اشاعت ۱۸۷۱ء میں ہوئی۔ اس قصیدے کا موضوع فارسی زبان کی نحو ہے۔ یہ قصیدہ داخل درس رہا۔ نیاز احمد خاں ہوشؔ کے سات قصائد ملتے ہیں جن میں ایک نعتیہ اور دو منقبت کے ہیں۔ باقی ماندہ چار قصائد میر محبوب علی خاں والیٔ دکن اور اس کے امراء کی مدح میں ہیں۔ ان قصائد میں صنف قصیدہ کی جملہ خصوصیات حیات ملتی ہیں۔ اس نے میر محبوب علی خاں کا سراپا پیش کرتے ہوئے تحریر کیا ؎

خال سے آنکھ کا کس طرح نہ ہو حسن ہزار
عین نقطے سے کرے غین کی پیدا صورت

متصل رخ کے نہ کسی طرح ذقن ہو اس کا
چاہ کو ہوتی ہے گلزار سے اکثر قربت

پائیں جب ایک جگہ جمع حیات اور عدم
منطقی کیوں نہ ہوں پھر قائل سر وحدت

شال کشمیر کے دو پھول ہیں بغلیں اس کی
خلد کافور ہوا دیکھ کے جن کی نزہت

ساقِ گردوں پہ رکھے فوق جو رہتے ہیں وہ ساق
پھر جو ہو مہرِ فلک نقشِ قدم کیا حیرت

ہوشؔ کے ہر ایک قصیدے میں ایسی تخیل طرازی، مضمون آفرینی، مبالغے اور شکوہِ بیان کا عمل ملتا ہے۔ اس کے قصائد پڑھنے کے بعد یہ گمان ہوتا ہے کہ قصیدہ نگاری کے ذہاب میں ہوشؔ کے قصائد آبدار موتی ہیں۔ غالبؔ و ذوقؔ کے قصائد کے بعد ہوش کے قصائد کی دریافت اور مطالعہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

دیگر قصیدہ نگاروں کی تفصیل اس طرح ہے کہ مولوی احمد رضا خاں رضاؔ نے بلاغت کلام سے بھرپور نعتیہ قصائد لکھے جو ان کے مجموعۂ کلام حدائق بخشش میں شامل ہیں۔ محمد حسین فرحتؔ

ابن میر غلام علی عشرت نے دو قصائد نواب کلب علی خاں (م ۱۸۸۷ء) والیٔ رام پور کی مدح میں تحریر کیے۔ ان میں ایک قصیدہ محسن کاکوروی (م ۱۹۱۵ء) کے قصیدے کی زمین میں ہے۔ اس کا مطلع ہے ؎

ٹھنڈی ٹھنڈی ہے ہوا جھوم رہے ہیں بادل
آئی برسات تر و تازہ ہیں باغ اور جنگل

دوسرا قصیدہ فارسی میں ہے۔

غلام بسمل اللہ بسمل (م ۱۸۹۸ء) نے ایک قصیدہ سلطان عبدالحمید شاہ ترکی کی مدح میں لکھ کر سلطان مذکور کو بھیجا اور اس کے صلے میں اپنی ہی خواہش پر غلاف کعبہ کا ایک ٹکڑا حاصل کیا۔ جو حسب وصیت اس کے کفن پر ڈال کر دفن کر دیا گیا۔ یہ قصیدہ اس کے خاندان میں محفوظ تھا۔ بعد کو کوئی غالب نواز لے گئے اور واپس نہیں کیا۔ اب وہ قصیدہ نہیں ملتا۔

مولوی ناصر الدین احمد ناصر (م ۱۹۰۸ء) نے متعدد قصائد نعت و منقبت تحریر کیے۔ ایک قصیدہ شہیدی کے مشہور زمانہ قصیدے کی زمین میں بھی تحریر کیا۔ ان قصائد میں قصیدے کا اُٹھان اور قصیدے کی شان ہے۔

حضور احمد خاں آثم (م ۱۹۴۴ء) نے انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں چھ قصائد تحریر کیے جو اس کے مطبوعہ مجموعۂ کلام منظور حق (م ۱۸۸۹ء) میں شامل ہیں۔ ان میں صرف دو قصائد ع پھر تو شرمندہ نظر آئیں غزالانِ حرم اور ع اہل اسلام ہوں۔ کیوں ہو مرے ایماں میں خلل۔ قدرے غنیمت ہیں ورنہ معلوم یہی ہوتا ہے کہ آثم کو قصیدہ نگاری سے فطری مناسبت نہیں تھی۔

مثنوی کے موضوعات میں بھی وسعت پیدا ہوئی۔ عشقیہ موضوع کے علاوہ مثنویات دیگر موضوعات پر بھی وجود میں آئیں۔ جوالا شنکر امیر نے کتھا ست نرائن کو دافع العذاب کے نام سے مثنوی کی شکل میں نظم کر کے ۱۸۷۲ء میں شائع کرایا۔ اس مثنوی میں قصہ پن ہے اور زبان تشبیہاتی و استعاراتی جس سے شبہ ہوتا ہے کہ مثنوی نگار کے اعصاب پر مثنوی گلزار نسیم سوار تھی۔

نواب احمد حسن خاں جوش (م ۱۸۸۶ء) نے ایک عشقیہ مثنوی مسمی فسانۂ جوش تحریر کی۔ اس مثنوی کے اسلوب میں شاعر نے جودتِ طبع کا مظاہرہ کیا۔ مثنوی پر خارجی تزئین کا اثر غالب ہے۔ نیاز احمد خاں ہوش نے مثنوی ترانۂ ہوش نظم کی لیکن اس مثنوی کا سراغ نہیں ملا۔ حضور احمد خاں آثم

نے ۱۸۷۹ء میں مثنوی ذائقہ عشق شائع کرائی۔ آثم کو مثنوی نگاری سے بھی فطری مناسبت نہیں تھی۔ ذائقہ عشق ایک اہم مثنوی نہیں ہے۔ مہربان علی فرحاںؔ نے تین مزاحیہ مثنویات تحریر کیں جو مثنوی کی تاریخ میں نہایت اہم کام ہے۔ ان مثنویات کے یہ نام ہیں: (۱) قصہ قاضی جون پور۔ (۲) احمق نامہ۔ (۳) آئینہ رونما یعنی حجام نامہ۔ ان میں قصہ قاضی جون پور بہت مشہور مثنوی ہے جو دوردرشن نے ٹیلی کاسٹ بھی کی تھی۔ فرحاںؔ نے سلیس اور مزاحیہ اسلوب اختیار کیا۔ الفاظ کی برجستگی اور رمز و معنویت سے مزاح کا لطف دوبالا کیا۔ مثلاً آئینہ رونما یعنی حجام نامہ کے یہ اشعار ؎

ذرا جو تیز مقراضِ زباں ہو حماقت مو بمو ان کی بیاں ہو
وہ تھی کسبت کہ سب کپڑا پھٹا تھا جو خود گُٹھّل تو گُٹھّل اُسترا تھا
وہ آئینہ کہ جس میں منہ نہ دکھلائے نظر کیجیے تو قلعی صاف کھل جائے
وہ قینچی کند سو پتھر کو چاٹے کہ بال آجائے گر اک بال کاٹے

اردو مثنویات کی تاریخ میں فرحاںؔ اور اس کی مزاحیہ مثنویات کا تعارف ضروری معلوم ہوتا ہے۔ (یہ مثنویات گلزار احمدی پریس مرادآباد سے شائع ہوئی تھیں۔ ان کے مطبوعہ نسخے سید تعظیم علی نقوی (م ۱۹۹۰ء) کے پاس کراچی میں محفوظ ہیں۔ ان کا ذکر فرحاںؔ کے ضمن میں نقوی نے اپنی تالیف تاریخ شعرائے روہیل کھنڈ کے حصہ بریلی میں کیا ہے۔ جو معلومات کا ماخذ ہے)۔

ناصر الدین احمد ناصرؔ نے اپنے صوفی مشرب کے پیش نظر مثنوی پیکر حشر ونشر تحریر کی۔ یہ مثنوی ۱۹۰۷ء میں شائع ہوئی۔ اس کی زبان سلیس، عام فہم لیکن معنویت و رمزیت سے لبریز ہے۔

عشقیہ مثنوی نگاری کے سلسلے میں اہم ترین مثنوی مسمی پیکر حسن کلب حسین مائلؔ (م ۱۹۱۱ء) نے ۱۸۹۹ء میں تحریر کرکے شائع کرائی۔ یہ ایک طویل مثنوی ہے جس کے اشعار کی تعداد دو ہزار پانچ سو انتیس ہے۔ قصہ تو وہی شہزادے اور شہزادی کے عشق۔ فوق فطرت واقعات اور عیش کوشی کے ماحول پر مبنی ہے لیکن جذبات نگاری، منظر نگاری اور بامحاورہ و برمحل زبان اس مثنوی کی بڑی خصوصیت ہے جس کا اندازہ مندرجہ ذیل اشعار سے ہوتا ہے ؎

اور پھر صبح و شام ہوتی ہے یہاں ترکی تمام ہوتی ہے

اب جو پھر کر وطن کو آئیں گے ناؤ ہم خضر کی چڑھائیں گے
بات پر لوگ اپنی مرتے ہیں کہتے ہیں جو زباں سے کرتے ہیں
پیٹھ جیسی دکھا کے جاتے ہو گر خدا چاہتا ہے آتے ہو
پھر طبیعت کمال گھبرائی زلفِ شب تا کمر لٹک آئی
یہ بھی لکھا مرے مقدر کا پھل مجھے ہو نصیب خنجر کا

اس مثنوی کا طباعت کے باوجود گمنام رہنا بڑی محرومی کی بات ہے۔ اردو مثنوی کے اسالیب زبان کو تلاش کرتے وقت اس مثنوی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

قاسم علی قاسم نے مثنوی پدماوت تحریر کی جو نول کشور پریس کانپور سے ۱۸۷۳ء میں شائع ہوئی۔ پدماوت پر شائع ہونے والی مثنویات میں قاسم کی طویل مثنوی دعوتِ مطالعہ دیتی ہے۔

بریلی کے سنی اور شیعہ ماہ محرم میں عزاداری کا اہتمام کرتے ہیں۔ بریلی میں سنی اور شیعہ امام باڑے ہیں۔ ماہ محرم میں مجالس۔ ماتم۔ جلوس فرتح تخت و تازیے۔علم۔ پیک۔ سبیل اور لنگر وغیرہ کا زبردست اہتمام ہوتا ہے۔شاید اس عزاداری کا اہتمام انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں اودھ کے زیر اثر ہوا۔اس عہد میں جتنے بھی کلیات طبع ہوئے یا قلمی دواوین ہمہ دست ہوئے ان میں واقع کربلا کے متعلق منظومات اور امام حسینؑ کی مدح میں مناقب ملتے ہیں۔ کمتر نوحہ۔ مرثیہ اور سلام تحریر میں آئے اور یہ سرمایہ بھی مختلف خاندانوں کی نجی بیاضوں میں محفوظ ہے جو علم۔ جلوس اور مجالس کے مواقع پر التزاماً پڑھا جاتا ہے۔ بریلی میں مرزا دبیر (م ۱۸۷۴ء) اور میر انیس (م ۱۸۷۵ء) ان کے خاندان اور تلامذہ کی طرح مرثیہ نگار نہیں ملتے۔ بریلی میں اودھ کی طرح مرثیہ نگاری کو فروغ میسر نہیں ہوا۔

اس عہد میں واسوخت اور سراپا نگاری زمرۂ شعراء میں بہت مقبول تھی۔اس صنف سخن کے مشہور ترین شعراء عبدالعزیز خاں عزیز۔ نیاز احمد خاں ہوش اور احمد علی خاں عاصی تھے۔عزیز کا واسوخت مسمّی شکایت معشوقاں مطبوعہ ۱۸۸۱ء گرمیٔ جذبات اور زور قلم کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ یہ محسوس ہوتا ہے کہ واسوخت نگار معاملات عشق سے عملاً واقف ہے۔ واسوخت ہوش ہم دست نہیں ہوا حالانکہ اس کی بہت شہرت تھی۔ احمد علی خاں عاصی کے مطبوعہ واسوخت کا نام نالہ دل شکن ہے۔

اس واسوخت میں بھی واسوخت کی خصوصیات ملتی ہیں۔واسوخت کے علاوہ سراپا نگاری میں بھی عبدالعزیز خاں عزیزؔ کو ہی منزلت حاصل ہے۔اس نے چھتیس بندوں پر مشتمل بہ شکل مسدس سراپا تحریر کیا جو بے مثل ولا جواب ہے۔بطور نمونہ چند بند مندرجہ ذیل ہیں ؎

همسری کی ہے کہاں مشک کو بالوں سے محال چھنستے ہیں آہوے چیں اس میں یہ ایسا ہے جال
دل عشاق سے اس زلف معنبر کا خیال نہیں ہوتا ہے جدا جیسے سویدا کا خیال
مانگ چوٹی کو جو دیکھا تو ہوا یہ روشن
دودھ کی نہر پہ آ بیٹھی ہے کالی ناگن

سینہ دریاے لطافت ہے تو پستاں ہے حباب یا سیہ کاگ لگائے ہوئے مینائے شراب
شوقِ نظارہ میں اس شیشے کے عاقل ہیں خراب حب افیوں ہے وہ ٹھنی کہ اڑاتی ہے خواب
ہم نے انگیا کی کٹوری کا جو نقشہ دیکھا
جام سے شیشۂ پر بادہ پہ الٹا دیکھا

ساق کی شمع سے بالا جو ہوا شعلۂ نار چشمۂ مہر بنا چشمۂ زانوے نگار
دیکھ لے پائے نگاریں کو جو محوِ دیدار مست ایسا ہو کہ ٹھوکر سے نہ ہووے ہشیار
گل کی پتی بھی جو زیرِ کفِ پا آتی ہے
آگ تلووں میں نزاکت سے بھڑک جاتی ہے

اس سراپا میں عزیزؔ کی محویت کا یہ عالم ہے کہ اس کی چشم تصور میں عورت کے وہ اعضاء بھی رقص کناں ہوئے جن کے ذکر سے شعرائے اردو نے بالعموم گریز کیا۔اس کی ژرف نگاہی نے عورت کے اس ''خط موے کمر'' کا احاطہ کیا جو ''سطحِ شکم'' کے گرد تھی اور اس کے بعد اس کو یہ لکھنے میں تامل نہیں ہوا کہ ؎

دیدباں گلشنِ فردوس کی دیوار میں ہے
چاک یا دامنِ عریانئِ دلدار میں ہے

بہرنوع وہ عہد ہی نشاط طلب تھا، زیادہ تر شعراء بریلی کو شعرائے لکھنؤ کی پرواز اور بلندی حاصل کرنے کی آرزو تھی۔عزیزؔ کو اس سراپا میں اپنے شخصی تلذذ اور عصری نشاط طلبی کو کامیابی

کے ساتھ پیش کرنے کا موقع ملا۔قدرت بیان اور زورِ قلم اس پر مستزاد ہے۔

نواب عبدالعزیز خاں عزیزؔ نے ملا حسن کاشی کے فارسی ہفت بند کا اردو میں بہ عنوان ہفت کوکب ترجمہ کیا جس کی طباعت ۱۸۷۲ء میں ہوئی۔عزیزؔ کے ہی ایک فاضل ہم عصر حیدر حسین راقمؔ نے بزبان فارسی ایک مخمس ہفت کوکب تحریر کیا جو طباعت سے محروم رہا۔(شائع ہوچکا ہے۔مطبع روہیل کھنڈ، بریلی ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء)

اس عہد میں مسدس۔مخمس۔مستزاد۔قطعات۔رباعیات کا انبار لگ گیا۔اس عہد کے شعراء کا مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام دیکھ کر یہ محسوس ہوا کہ گویا شعراء کے مابین کثرت کلام اور جدت کلام کی معرکہ آرائی تھی اور ان میں سے ہر ایک نمایاں ہونا چاہتا تھا۔اس زمانے کی ایک تاریخی دستاویز پرستم داس یتیمؔ کا نیم ادبی مسدس مسمی قحط چھ سیرا ہے۔بریلی میں یہ قحط ۹۶-۱۸۹۷ء میں پڑا تھا۔قحط میں گیہوں کا نرخ چھ سیر فی روپیہ ہوگیا اور غریبوں نے بوجہ افلاس اپنے بچے فروخت کیے۔یتیمؔ نے اس مسدس میں ان دولت مندوں کی چٹکیاں لیں جو قحط کی وجہ سے پریشان تھے۔اس مسدس کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ شاعر نے جس طبقے کے پیشہ ور کا حال بیان کیا اس کے مطابق الفاظ اور روزمرہ بھی استعمال کیا۔چنانچہ یہ مسدس طنز ملیح اور اسلوب بیان کی وجہ سے اشتہاری سا بن گیا۔اس کی طباعت بزمانۂ قحط ہوئی۔بطور نمونہ ایک بند مندرجہ ذیل ہے ؎

نائکہ کو سے ہے قسمت کو کہ آفت آئی　　دس اشرفی تو میں لے لیتی تھی پہلے سائی

قحط صاحب نے کی جس دن سے کرم فرمائی　　کوئی آکر نہیں دیتا ہے بجز یک پائی

مال و اسباب جو تھا بیچ کے کھایا سب کو

قحط چھے سیر نے ہے ناچ نچایا سب کو

مختصر یہ کہ بریلی کی تاریخ شاعری کا وہ عہد جو لگ بھگ انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر کو محیط ہے، شعری تخلیقات اور اسالیب سخن کا عہد ہے۔بیسویں صدی عیسوی میں بریلی کی شاعری بڑے جوش اور طمطراق کے ساتھ داخل ہوئی۔

بریلی میں انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر تک جو حالات پیدا ہوئے ان کا اختصار یہ ہے: عربی مدارس کھلے۔تحریک ندوہ کا زور بندھا۔بریلوی دیوبندی قادیانی اختلافات رونما

ہوئے ۔مغربی تعلیم کی اشاعت ہوئی ۔انگریزی داں طبقہ چھوٹی سرکاری ملازمتوں پر فائز ہوا۔ انگریزی ذریعہ معاش بن گئی ۔کارخانے کھلے ۔ریل آئی ۔سڑکیں پختہ ہوئیں ۔نئی سڑکیں اور پل تعمیر ہوئے ۔زراعت کے طریقے بدستور قدیم تھے ۔زمیندار اور انگریز نواز طبقہ خودغرض اور عیش پسند تھا ۔انگریز حاکموں ، زمینداروں اور انگریز نوازوں نے غریبوں کو ان کی محنت کے مطابق حصہ نہیں دیا ۔کاشتکار ۔مزدور ۔ہنرمند دن بہ دن غریب ہوتا گیا ۔اس کی سماجی حیثیت کمتر ہوگئی ۔ فوجیوں اور امراء کی دلبستگی کے لیے طوائفیں آباد ہوئیں جو مشہور اور صاحب حیثیت بن گئیں ۔ اعلا تعلیم یافتہ تھے لیکن وہ مناظروں میں پھنس گئے ۔آریہ سماجی ۔عیسائی پادری ۔ بریلوی ۔ دیوبندی ۔قادیانی آپس میں مناظرے کرتے ۔ان کی اعلیٰ صلاحیتیں مناظروں کی نذر ہوگئیں ۔ سیاسی بیداری کا دور دور پتہ نہیں تھا ۔۱۸۵۷ء کا صدمہ کم ضرور ہوا لیکن بالکل ختم نہیں ہوا تھا ۔ لوگ انگریزوں اور انگریز نوازوں سے خوف زدہ تھے ۔ان حالات کا احاطہ نثر نگاروں اور صحافیوں نے کیا ۔ اصلاح کی ضرورت محسوس کی اور مغرب زدگی کے مضر اثرات کو محسوس کیا انہیں اپنی کسمپرسی اور انگریزوں کی حاکمیت نے بھی غیرت دلائی ۔صحافیوں اور نثر نگاروں میں عصری شعور اور مسائل کا ادراک ملتا ہے ۔مثلاً مولانا احسن نانوتوی (م ۱۸۹۵ء) نے احسن الاخبار بریلی کے اجراء اور مطبع صدیقی بریلی کے ذریعہ تحریک ولی اللّٰہی کی اشاعت کی ۔شاعروں نے نئے رجحانات کو قبول نہیں کیا ۔انہوں نے نظم نگاری کی طرف بھی توجہ نہیں دی ۔انہوں نے غزل گوئی جاری رکھی اور مروجہ اسالیب غزل میں کچھ ندرت اور کچھ جدت پیدا کرنے کی کوشش کی ۔

بیسویں صدی عیسوی کے ربع اول میں شعرائے بریلی کی غزلیات کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنوی طرز سخن کے اثرات کم ہوئے ، بالکل معدوم نہیں ہوئے ۔نواب عبدالعزیز خاں عزیزؔ کے تلامذہ نے پرواز خیال اور قدرت زبان کی طرف زیادہ توجہ دی لیکن وہ شوخیِ گفتار سے آگے نہ بڑھ سکے ۔مفتیان نے غالبؔ سے رشتہ قائم رکھا لیکن شخصی حسیت اور مشاعروں کی ضرورت کے مطابق ان کا تغزل شیفتہؔ (م ۱۸۷۰ء - ۱۸۶۹ء) جیسا ہوگیا جو ظاہر ہے خود ایک کمال تھا ۔عام میلان امیرؔ و داغؔ کے سخن کی طرف تھا ۔مشاعروں میں اس طرز سخن کی بہت مانگ تھی ۔اس دور کے بڑے بوڑھے ان اشعار کو ''زبان کا شعر'' کہتے تھے ۔مندرجہ ذیل

اشعار سے اس زمانے کی غزلیات کے رجحانات کا اندازہ ہوسکتا ہے ۔

اے زاہدو نماز اگر بہر حور ہے
نیت کا ہے فساد سمجھ کا قصور ہے
قاسم علی خواہاںؔ تلمیذ امیر الدین آزادؔ

آیا نہ ان کو تفرقۂ جان و دل پسند
دل لے چکے تھے جان بھی اب آ کے لے چلے
قاضی عبدالجمیل جنونؔ تلمیذ غالبؔ

اس آسرے پر غم غلط ہوتا ہے فرقت میں
غنیمت ہے ہمیں امیدِ مرگِ ناگہاں پھر بھی
عماد الحسن محوؔ تلمیذ غلام بسمل اللہ بسملؔ

کاکل تو دوش پر ہے مگر ربط سر سے ہے
الفت بلا کی خانہ بدوشوں کو گھر سے ہے
علی حسن شاعرؔ تلمیذ عبدالعزیز خاں عزیزؔ

شمع کو دی ہے زباں یارب تو گویائی بھی دے
کچھ تو وہ اپنی کہے یا پوچھے پروانے کی بات
عبدالصمد سرشارؔ تلمیذ عبدالعزیز خاں عزیزؔ

یہ مانا روبرو ہیں وہ محال ان کا نظارا ہے
کوئی پردہ نہیں حائل تو حیرت میرا پردا ہے
رستم یار بیگ قیصرؔ تلمیذ عبدالعزیز خاں عزیزؔ

یارب اسی طرح میری میت پڑی رہی
بیٹھے رہیں وہ بال پریشاں کیے ہوئے
شفیع احمد عیشؔ تلمیذ داغؔ

ملتا اگر عمامۂ واعظ تو خوب تھا
چادر ہمیں چڑھانا تھی اک بادہ خوار کی
نثار حسین جعفری آرزوؔ تلمیذ قیصرؔ

سوالِ وصل پہ بھیجا ہے لام الف لکھ کر
جواب اس کا نہیں یہ کہ لا جواب میں ہے
نانک چند اوجؔ تلمیذ حسنؔ

اللہ ڈھائے اس بتِ مغرور کی خودی
کہتا ہے طنز سے ''مجھے مانگیں خدا سے آپ''
مکھن لال شوقؔ تلمیذ امیر مینائیؔ

جو بنائے نہ بنے ہے وہ مقدر میرا
جو نہ مقبول ہو وہ میری دعا ہوتی ہے
عبدالقادر مفتونؔ تلمیذ عزیزؔ

دل کو پرواہ نہیں سختی وہ اگر کرتے ہیں
اپنے نالے بھی تو پتھر میں اثر کرتے ہیں
سوہن لال شفاؔ تلمیذ ہوشؔ

جب میں روتا ہوں کلیجے سے دھواں اٹھتا ہے
مینہ برستا ہے یہاں روز گھٹا سے پہلے
نورالحسین شایاںؔ تلمیذ فرحاںؔ

رواں پتہ یہ چلا انتہائے منزل پر
کہ اب یہاں سے چلوں تیری جستجو کے لیے
ہادی علی رواںؔ تلمیذ خواہاںؔ

پسِ مردن یہ جوشِ وحشت ہے
چھلنی نالوں سے قبر کی چھت ہے
پیارے علی ارمؔ تلمیذ آثمؔ

بریلی میں بیسویں صدی عیسوی کے ربع اول کے محتشم شعراء میں قاسم علی خواہاںؔ۔ علی حسن شاعرؔ۔ عمادالحسن محوؔ۔ عبدالصمد سرشارؔ۔ رستم یار بیگ قیصرؔ اور شفیع احمد عیشؔ کا شمار کیا جا سکتا ہے۔

قاسم علی خواہاںؔ نے طویل عمر پائی (۱۸۴۵ء تا ۱۹۳۸ء)۔ اس نے بریلی کی شاعری کا پورا عہد وسطیٰ اور عہد آخر دیکھا۔ اس کے دواوین محفوظ نہیں رہے۔ چند بیاضیں اس کے خاندان میں محفوظ ہیں۔ اس کا کافی کلام بریلی کے گلدستوں میں شائع ہوا۔ اس کے استاذِ سخن ہونے میں شبہ نہیں۔ مضمون طراز اور تخیل پرست تھا۔ کبھی کبھی شوخ اشعار بھی لکھتا۔ بسیار گوئی نے اس کے فن شاعری کو بدصورت کیا۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے صدہا شعراء کے کلام پر اصلاح دی اور ضرورتاً اپنا کلام بھی مشاعروں میں تقسیم کیا۔ اس کا صحیح مقام ایک مربی سخن کا ہے۔

علی حسن شاعرؔ (م ۱۹۱۸ء) اپنے استاذ نواب عبدالعزیز خاں عزیزؔ کے باغ سخن کا گل رنگیں تھا۔ چستی کلام اور بندش الفاظ کا ماہر تھا۔ اس کے اشعار نے مبالغے۔ تشبیہ۔ استعارے اور تمثیل کی وہ بلندی تو نہیں چھوئی جس کی مہارت اس کے استاذ کو تھی لیکن شوخی کلام میں لاجواب تھا۔ نواب مرزا داغؔ کے پیدا کردہ ماحول شاعری میں بھی اس سے زیادہ بریلی کا کوئی شاعر شوخ گفتار نہیں تھا۔ نمونۃً چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں ؎

اے رندو کہیں اور چلو خلد سے بھاگو
وہ مولوی صاحب بخدا دیکھ رہے ہیں

ملت ہے جبھی تک کہ اسے دیکھے نہ زاہد
لاؤ جو مئے ناب تو حرمت سے بچا کے

بن بن کے پوچھتے ہیں تجاہل کو دیکھیے ملنا ہمارا مدنظر کس نظر سے ہے
جاتے تھے وہ گھر غیر کے اچھی ہمیں سوجھی یہ کہہ کے انہیں روک لیا دیکھ رہے ہیں

ایسی شوخ کلامی کے علاوہ اس کی چست اور سلیس زبان اپنی علاحدہ آن بان رکھتی ہے۔ مثلاً ؎

دل ملے گویا کہ ملنا ہوگیا دل میں شک آیا جدائی ہوگئی
یہاں ہے نام چلنے کا ٹھہرنا قیام اپنا ہے بس عمر رواں تک
کیا جانے کوئی قصد ہمارا ہے کہاں کا کعبے میں کھڑے قبلہ نما دیکھ رہے ہیں
یہ سرائے فانی کی شان ہے کہ امید و بیم میں جان ہے
میرے پیچھے پیچھے زوال ہے اگر آگے آگے کمال ہے

علی حسن شاعؔر کا دیوان طبع نہیں ہوا۔ اس کا کلام ضائع ہوگیا۔ اس کا جتنا کلام ہم دست ہوا اس سے اس کی شوخی ذہانت اور قدرت زبان کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس حیثیت میں وہ منفرد سا نظر آتا ہے۔

مفتی عماد الحسن محوؔ (م ۱۹۲۵ء)۔ مفتی سلطان حسن خاں احسنؔ کا پسر اور غلام بسمل اللہ بسملؔ کا شاگرد تھا۔ اس طرح اس کی غالبؔ سے نسبت بہت قوی تھی۔ محوؔ کی غزل میں احساس کی شدت کے ساتھ خیال کی نزاکت غالب ہے لیکن اس نزاکت میں جذبات کی گرمی ہے۔ معاملات کی شوخی ہے۔ اس کا تغزل شیفتہؔ سے قریب تر ہے۔ اس کے اشعار میں الفاظ کی بندش بھی ایک حسن ہے۔ اس کے جملہ کلام میں تغزل کا نشاط آگیں نکھار ہے جو متاثر کرتا ہے۔ اس کے طرز سخن کا اندازہ مندرجہ ذیل اشعار سے ہوسکتا ہے ؎

خلش نوکِ مژہ کی ہے سہارا زندگانی کا یہ نشتر دل میں چبھ چبھ کر رگِ جاں ہوتے جاتے ہیں
اسی کے آسرے پر غم غلط ہوتا ہے فرقت میں غنیمت ہے ہمیں امیدِ مرگِ ناگہاں پھر بھی
تعریف غیر کی تو ہوئے ہم زبان وہ میری زباں کے واسطے ان کا دہن ہوا
پڑ گیا لذتِ دشنام کا چسکا کیسا ہوگئی ترکِ خطا اور بھی مشکل مجھ کو

عبد الصمد سرشارؔ (م ۱۹۲۷ء) تلمیذ عبد العزیز خاں عزیزؔ نے دو دیوان مرتب کیے۔ ایک

فارسی اور ایک اردو کا۔ اس کی غزلیات میں بھی تغزل کا رنگ چوکھا ہے لیکن نزاکت و حیاداری کے ساتھ۔ زبانِ غزل بھی سریع الفہم اور پر اثر ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہجوم شعراء میں اس کا قدِ بالا بھی دور سے دکھائی دیتا ہے۔ نمونۂ کلام مندرجہ ذیل ہے ؎

تیغ سے پیچھے کیا ذبح ادا سے پہلے	مار ڈالا میرے قاتل نے قضا سے پہلے
ملا کے خاک میں برباد کر چکے ہم کو	خدا کے واسطے دل میں نہ اب غبار رہے
اب جانے دیجئے آنے کا وعدہ نہ کیجئے	جھوٹا کریں گے مجھ کو کہاں تک قضا سے آپ
شمع کو دی ہے زباں یارب تو گویائی بھی دے	کچھ تو وہ اپنی کہے یا پوچھے پروانے کی بات

مرزا رستم یار بیگ قیصرؔ (م ۱۹۳۰ء) تلمیذ عبدالعزیز خاں عزیزؔ نے اپنے استاذ کا اتباع کیا۔ گلاب کی پتی سے ہیرا تراشنے کی کوشش کی۔ اس کی حالت اس شجر کی سی ہوگئی تو کسی بڑے پیڑ کے زیرِ سایہ اگتا ہے۔ اس کے اشعار غزل میں پختگی ہے لیکن وہ نکھار اور دلربائی نہیں جو عزیزؔ۔ حسنؔ۔ محوؔ۔ شاعرؔ اور سرشارؔ کی غزلیات میں ملتی ہے۔ خواہاںؔ کی طرح اس کا فن بھی بسیار گوئی اور تلامذہ نوازی کی نذر ہوگیا۔ اس کا صحیح مقام ایک مربی سخن کا ہے۔ اس کے اشعارِ غزل کا نمونہ یہ ہے ؎

خیالِ قتل کیا آیا؟ سرِ تیغِ سرافگن میں	تلاطم خون کا پیدا ہے کیوں رگہائے گردن میں
بقدرِ ظرف ہیں سب قدرداں روشن دماغوں کے	کہ چشم چاہ میں خورشید بھی چھوٹا سا تارا ہے
جو گرم سیرِ چمن گل عذار ہوجاتا	عرق جو آتا وہ عطرِ بہار ہوجاتا
سلجھا رہے ہیں زلف کو شانہ ہے ہاتھ میں	ساماں ہوا ہے جمع مرے انتشار کا
غرورِ حسن سے سینہ ابھارے وہ جو پھرتے ہیں	نمود آثار ہوتے ہیں جوانی کے لڑکپن میں

بہر نوع یہ بھی ایک طرز سخن تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نواب عبدالعزیز خاں عزیزؔ کی نزاکت اور بداعت قیصرؔ کے یہاں طرز ناسخؔ لکھنوی بن گئی۔

(باقی)

لکھنؤ کی تہذیب کے فروغ میں عربی زبان وادب کے اثرات چکبست کے حوالہ سے

ڈاکٹر محمد فیضان بیگ

موجودہ ہندوستان کی حسین گنگا جمنی تہذیب اور رشک جہاں تمدن کے فروغ میں عربی زبان و ثقافت کے انمٹ نقوش اتنے گہرے ہمہ گیر و ہمہ جہت ہیں کہ بے انتہا واضح اور ظاہر ہونے کے باوجود اس کے اندر رچے بسے عناصر کے استخراج کا کام ایک مستقل کاوش اور دقیق مطالعہ کا متقاضی ہے۔ عربی زبان و ثقافت کے مختلف پہلو اس طریقے سے ہمارے تمدن کا جزو لاینفک بن چکے ہیں کہ بعض اوقات ان کے عربی الاصل ہونے کی طرف توجہ بھی نہیں ہوتی لیکن اس قسم کے مطالعہ سے بڑے ہی عجیب و دلچسپ حقائق ونتائج سامنے آتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ اس نوع کے بیشتر اثرات اسلامی عقائد و اقدار کی راہ سے اور فارسی کے توسط سے ہمارے یہاں آئے ہیں، لیکن ان کا عربی تشخص و امتیاز اب تک محفوظ ہے۔ نیز یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اس خطہ رشک جناں یعنی ہندوستان کے طول وعرض میں، مسلم فرماں رواؤں کے دور حکومت سے لے کر ریاستوں اور راجواڑوں اور پھر آج کے دور تک کے ہندوستان تمدن کی بوقلمونی و نیرنگی اور زبان ہندوستانی کی شیرینی بہت بڑی حد تک انہیں اثرات کی دین ہے اور اگر اس کو ان سے الگ کر کے دیکھا جائے تو اس کا رنگ بے حد پھیکا نظر آئے گا۔ اور جہاں تک زبان کا تعلق ہے تو یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی قوم کی زبان صرف

شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

اس کے تمدن کی نمائندگی ہی نہیں کرتی بلکہ ایک طرف اس تمدن کے تشکیلی عناصر کا پتہ دیتی ہے تو دوسری طرف اس کے فروغ کے سفر میں اس کی رہبری میں بھی اپنا بے پناہ کردار ادا کرتی ہے۔

اردو زبان میں بعدیات، لفظیات، تلمیحات، اسلوبیات سے لے کر تخیلات و تصورات اور اصناف ادب وغیرہ تک کا کون سا پہلو ایسا ہے جو عربی کے دائرہ اثر سے باہر ہو۔ مثلاً ان اصوات کی ضرورت نہ ہونے کے باوجود ث، ص، ذ، ض، جیسے حروف مستعار لینا فارسی اور اردو کی مجبوری تھی۔ الفاظ کے خزینہ سے عربی الفاظ کا سرمایہ نکال لیا جائے تو فارسی و اردو لغت قلاش ہو جائے۔ ان میں سے کچھ الفاظ معنیً ولفظاً اب تک اپنی اصلی عربی شکل میں جوں کے توں اردو میں مستعمل ہیں۔ جیسے الفاظ، معنی، شکل وغیرہ۔ کچھ الفاظ تو اپنی اصل عربی شکل پر ہیں لیکن معنی اردو میں آکر کچھ مختلف ہو گئے ہیں جیسے لغت، صاحب وغیرہ۔ کچھ اردو الفاظ عربی الفاظ کی بگڑی ہوئی شکل ہیں جیسے گلک جس کا اصل ہے غلق یعنی (بند)، نوج یعنی نعوذ باللہ۔ احتیاطاً ادباً وغیرہ جیسی ترکیبات بھی عربی ہیں اور اسی نہج پر اندازاً جیسے نئی ترکیبات بھی اردو میں ڈھالی گئی ہیں۔

شمالی ہندوستان کے مختلف حصوں میں آنے والے حکمراں اپنے ساتھ وسطیٰ ایشیا ایران وغیرہ کے تمدن اور زبانیں بھی لائے۔ یہ حکمراں مسلمان ہونے کی وجہ خود اسلام اور عربی زبان و تمدن سے گہرے طور پر متاثر تھے، ان کے ساتھ علماء وفضلاء کی ایک تعداد بھی ساتھ ہوتی تھی۔ ان کے ذریعہ ہندوستان کے قدیم تمدن کا رنگ بدلتا چلا گیا۔ مسلم فرماں رواؤں کے علاوہ ہندوستانی تہذیب کی تشکیل میں صوفیائے کرام کا بھی بڑا ہاتھ رہا ہے اور ان کے ذریعہ سے بھی ان عربی عناصر کی بڑی مقدار ادھر منتقل ہوئی ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ دہلی 'جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب' ارباب فن کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ پھر سلطنت مغلیہ پر جب ادبار کا دور آیا تو عافیت کی تلاش میں ارباب فن کا رخ ان ریاستوں کی طرف ہوا جو پہلے ہی سے اپنے ادب پرور ماحول اور اہل ادب کی قدر شناسی کے لیے مشہور تھیں جن میں سب سے نمایاں نام اودھ کا ہے جس کے مرکزی شہر لکھنؤ نے اردو ادب کی ان روایات کو جنم دیا جن کو دبستان لکھنؤ کے نام سے جانا جاتا ہے۔

لکھنؤ کی اپنی ایک تہذیب اور تہذیبی پس منظر تھا، جس کا خمیر و ضمیر عربی و فارسی تمدن کی

مٹی سے تیار ہوا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ عمومی طور پر فارسیت کے اثرات ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی طرح یہاں بھی زیادہ تھے لیکن اول تو یہ فارسیت خود ہی بہت بڑی حد تک عربیت اور اسلامیت کے زیر اثر آچکی تھی۔ دوسرے اسلام اور علوم عربیہ اسلامیہ کی وجہ سے عربیت کے اپنے اثرات بھی کچھ معمولی نہیں تھے۔ لکھنؤ کے فروغ سے پہلے خود اودھ میں علم دین کا جو غلغلہ بلند تھا، مولانا عبدالحلیم شرر اس کے بارہ میں لکھتے ہیں: ''یہاں ہر زمانے میں ڈھاکے، بنگالے، گجرات، مالوہ، حیدرآباد، شاہ جہاں آباد، لاہور، پشاور، کابل، کشمیر اور ملتان وغیرہ کے طالب علموں کا ایک بڑا بھاری گروہ موجود رہتا، جو علماء کی درس گاہوں میں تعلیم پاتے اور اس چشمۂ علم سے، جو فیض آباد میں جاری تھا، سیراب ہو ہو کے اپنے گھروں کو واپس جاتے''۔(۱)

شیراز ہند جون پور میں علم کی جو بساط بچھائی گئی تھی اس کے فیوض کے سوتے اب تک جاری تھے۔ خود لکھنؤ میں بادشاہت کے قیام اور اثنا عشریت کے غلبہ سے بھی پہلے عالم گیرؒ کے دور میں اسی کے فرمان سے ملا نظام الدین کی تشریف آوری ہوچکی تھی، ملا صاحب کے قدوم کی برکت سے لکھنؤ علم و فضل کا مرکز اور طلبہ علوم کا مرجع وماویٰ بن گیا تھا، شرر اس کے اعتراف میں لکھتے ہیں: ''فقط ایک چیز لکھنؤ میں اس دربار کے قائم ہونے سے پہلے موجود تھی اور وہ عربی کا علم و فضل تھا، جس کی بنیاد اس وقت پڑ گئی تھی جب شہنشاہ اورنگ زیب نے فرنگی محل کے مکانات ملا نظام الدین سہالوی کو عطا کیے تھے۔ ملا صاحب ممدوح اور ان کے خاندان کے قیام نے چند ہی روز میں فرنگی محل کو ہندوستان کی ایک ایسی اعلاترین یونیورسٹی بنادیا کہ سارے ہندوستان کے علماء وفضلاء کا مرکز لکھنؤ کا یہی چھوٹا سا محلّہ قرار پایا''۔(۲)

بعد میں جب بادشاہ کے مذہبی انہماک کی وجہ سے شیعیت کا غلبہ ہوا، علماء فرنگی محل کی طرف حکام کی وہ توجہ نہ رہی اور شیعی اجتہاد کا عروج ہوا تو ادب عربی کا اہتمام اور بھی بڑھ گیا۔ پہلے مجتہد خود بھی فرنگی محل کے ہی خوشہ چین تھے۔ بقول شرر: ''مجتہدین شیعہ کا آغاز بھی فرنگی محل ہی سے ہوا۔ لکھنؤ کے پہلے مجتہد مولوی دلدار علی صاحب نے بھی ابتدائی کتب درسیہ فرنگی محل ہی میں پڑھی تھیں۔ پھر عراق میں جا کے علمائے کربلا و نجف کے سامنے زانوے شاگردی تہہ کیا اور واپس آکے خود فرنگی محل والوں کی تصدیق وتقریب سے مجتہد اور شیعہ فرماں روایان وقت کے مقتدا قرار

پائے''۔(۳) شیعہ علماء کو ادب عربی کے ساتھ جو خصوصی شغف تھا اس کا تذکرہ کرتے ہوئے شرر فرماتے ہیں: ''انھوں نے چونکہ عراق میں تعلیم پائی تھی، لہٰذا عربی کا نیا ادبی ذوق اپنے ساتھ لائے اور ادبیت میں خاندان اجتہاد اور لکھنؤ کے شیعہ علماء کو فرنگی محل والوں پر ہمیشہ فوقیت حاصل رہی اور آج تک حاصل ہے۔ علمائے شیعہ کے ادبی مذاق نے لکھنؤ کو ادب کی تعلیم کا اعلیٰ ترین مرکز بنادیا جس نے مفتی میر عباس صاحب کا ایسا ادیب گراں پایہ پیدا کیا۔ ادب، شاعری اور عروض عربی کو علماء شیعہ و مجتہدین لکھنؤ نے اپنا بنالیا تھا''۔(۴) ادھر علماء فرنگی محل کا علوم عربیہ میں اپنا ایک مقام تھا جو قائم تھا اور آخر میں تو مولانا عبدالحئی صاحب جب براہ راست مکہ مکرمہ کے علماء سے سند لے کر آئے تو لکھنؤ میں وہ مسند علم سجی جس کو آج تک یاد کیا جاتا ہے۔ سید احمد شہید رائے بریلوی کی روح پرور تحریک کے اثر سے ایمان کی جو باد بہاریں ملک کے طول و عرض میں چلی تھی اس کی خنکی لکھنؤ کی فضا میں اب تک محسوس کی جاتی تھی۔

ان سب دینی عوامل اور عربی کی علمی ادبی فضاؤں کا لکھنؤ کے عوام و خواص اور معاشرہ کے ہر طبقہ کی زبان، طرز تخاطب، عادات و اطوار، انداز نشست و برخاست، اور سوچ پر کیا کچھ اثر رہا ہوگا اور وہاں کی تہذیب کے فروغ میں عربی زبان و ثقافت نے کتنا اہم، دوررس اور بنیادی کردار ادا کیا ہوگا اس کا اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ پنڈت رتن ناتھ سرشار نے فسانۂ آزاد میں لکھنؤ کی تہذیب کے جو زندۂ جاوید مرقعے پیش کیے ہیں اور جن کو اپنی ظرافت اور غیر سنجیدہ مبالغہ آمیزی کے باوجود حقیقت نگاری کے زمرہ سے خارج کرنا ناانصافی ہوگی، اس کے بارے میں میرا خیال ہے کہ عربی زبان و علوم کی خاصی شد بد رکھے بغیر اس سے پورے طور پر لطف اٹھانا بلکہ اسے سمجھنا بھی مشکل ہے۔ اس دور کے لکھنؤ کی تہذیب و معاشرہ کے ہر پہلو پر عربی زبان و ثقافت کے اتنے گہرے اثرات نظر آتے ہیں کہ نواب صاحب کے خوشامدی مصاحبین کے بقول نواب کا بٹیر 'صف شکن شاہ' تک عربی جانتا ہے۔ فسانہ کا ہیرو آزاد، علوم عربیہ میں طاق ہے۔ جب نواب صاحب اس کے جملہ کمالات معلوم کرنے کے لیے اس سے پوچھتے ہیں: ''کیوں بھئی معقولات میں بھی کچھ دخل ہے یا لنگوٹا باندھ کر کشتی اور دھینگا مشتی ہی جانتے ہو؟'' تو جواب ملتا ہے: ''کون؟! میں؟! معقولات؟! ہونھ! عمر بھی کیا کیا کیے۔ اس فن کی وہ کون

سی کتاب ہے جس پر ایں جانب نے نکتہ چینی نہیں کی ، فقہ امامیہ اور فقہ حنفیہ اور کتب تفسیر و تصوف جس میں چاہیے بحث کیجیے''۔(۵) اور تو اور آزاد کی محبوبہ حسن آرا تک بغیر اس کی لیاقت کا امتحان لیے اس کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی اور اس کے لیے وہ اس سے جو سوالات کرتی ہے اس میں بھی وہ ''تقدم کی دو چار مثالیں اور علم منطق کی تعریف'' ہی پوچھتی ہے۔(۶)

آیندہ سطور میں اسی موضوع کے ایک پہلو کے ایک گوشہ کے محدود مطالعہ کی سعی ناتمام کی گئی ہے۔ اور اس کے لیے عمداً بطور نمونہ ایک ایسی شخصیت کا انتخاب کیا گیا ہے جو مذہباً ہندو اور نسباً کشمیری پنڈت تھا تا کہ اس تہذیب کے فروغ میں پائے جانے والے عربی عناصر کے اثرات کا اندازہ ہو سکے۔ مراد پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی ہیں۔

لکھنؤ میں کشمیری پنڈتوں کے بہت سے خاندان آ کر آباد ہو گئے تھے اور یہاں کی تہذیب میں شیر و شکر ہو گئے تھے۔ ان لوگوں کو نہ صرف یہ کہ معاشرہ میں ممتاز و معزز مقام حاصل تھا بلکہ ان میں سے متعدد حضرات ذوق سخن گوئی میں بھی اعلیٰ مقام رکھتے تھے اس دور کے لکھنؤ کے کئی نامور شعراء کا تعلق ان ہی کشمیری پنڈتوں کے خاندانوں سے تھا جو اپنی ہندو روایات کے باوجود لکھنوی تہذیب کے اس فارسی عربی رنگ میں اس درجہ رنگ چکے تھے کہ تمیز مشکل تھی۔ مثال کے طور پر پنڈت دیا شنکر نسیم ، پنڈت رتن ناتھ سرشار ، پنڈت امر ناتھ شعلہ ، پنڈت جے گوپال زتشی ، پنڈت بشن نرائن وغیرہ کے نام ذکر کیے جا سکتے ہیں۔ خود چکبست کے والد پنڈت اودت نرائن جو ڈپٹی کمشنر تھے۔ ایک اچھے شاعر تھے ، یقینؔ تخلص کرتے تھے۔ اور رتن ناتھ درؔیا سے اصلاح لیتے تھے۔ ان کا منتخب شعر ہے ع

اللہ اللہ اثر نالوں کا تیرے بلبل
پردۂ غیب سے گل چاک گریباں نکلا (۷)

اللہ ، اثر ، بلبل ، غیب جیسے متعدد عربی الفاظ ، نیز نالوں کا اثر اور پردۂ غیب کا عربی اسلامی تصور ، صنعت حسن تعلیل جیسے اتنے بہت سے عربی الاصل عناصر اس ایک شعر میں موجود ہیں۔

ان کی ایک اور غزل کے چند اشعار اس طرح ہیں (۸):

جفائے چرخ سے فرصت ملی نہ دم بھر کی ہم اپنے حال سے کیوں کر انہیں خبر کرتے

ہوا اثر نہ ترے دل میں سخت حیرت ہے یہ نالے وہ تھے کہ پتھر میں بھی اثر کرتے
فرشتے کرتے فغاں آسمان ہل جاتے ہم ایک نالہ جو اے چرخ کھینچ کر کرتے
غنی ہوئے ہیں یہاں دولت قناعت سے وہ ہم نہیں جو تمنائے سیم و زر کرتے
یقیںؔ قابو میں رکھتے جو نفس سرکش کو زمیں پہ کار ملائک یہی بشر کرتے

ان اشعار میں عربی الفاظ پر مستزاد وہ تعبیرات ہیں جن میں عربی کی واضح جھلک موجود ہے۔ مثلاً جفائے چرخ میں قرآنی آیت **فما بکت علیھم السماء** کا پرتو ہے۔ 'پتھر میں بھی اثر کرتے' کی تعبیر '**ثم قست قلوبھم فھی کالحجارۃ أو اشد قسوۃ**' کا صاف چربہ معلوم ہوتی ہے۔

فرشتوں کی فغاں سے آسمانوں کا ہل جانا، اس تعبیر پر '**یھتزلہ العرش**' کا عکس ہے۔ اگلے شعر میں 'غنی ہوئے ہیں یہاں' کے مصرعہ میں '**ان الغنی غنی النفس**' کا مضمون باندھا گیا ہے۔ اور نفس سرکش والے آخری شعر میں '**ان النفس لأمارۃ بالسوء**' اور '**أتجعل فیھا من یفسد فیھا ویسفک الدماء**' کا خیال جلوہ گر نظر آتا ہے۔

پنڈت اودت نرائن یقیںؔ نے پنڈت جے گوپال زتشی کی جو تاریخ وفات (۹) لکھی ہے اس کے ہر ہر حرف سے عربیت مترشح ہے۔ ایک تو تاریخ وفات نکالنے کا فن ہی عربی ہے۔ دوسرے تاریخ بھی سن ہجری سے نکالی گئی ہے۔

یقیں کو جب ہوئی تاریخ کی فکر سرِ ہجرت سے ہاتف نے صدا دی
سنِ ہجری سے کہہ تاریخِ رحلت گئے بیکنٹھ میں جے گوپال زتشی

اس کے علاوہ بھی نظم میں متعدد عربی الفاظ و تعبیرات، تلمیحات موجود ہیں۔ ملاحظہ ہوں:

بزرگِ قوم جے گوپال نامی کہ جن کا عرف تھا مشہور زتشی
متانت اور لیاقت میں یگانہ سخاوت حاتمِ طے سے بڑھی تھی

قوم، عرف، مشہور، متانت جیسے الفاظ اور پھر حاتم طائی کی تلمیح سراسر عربی ہے۔ آگے کہتے ہیں:

انہیں ضیق النفس نے آدبایا ورم نے اور اس پر زیادتی کی

اطباء سے رجوع لائے اعزا ہر اک تدبیر بہبودی کی سوچی

غور فرمائیں کہ ضیق النفس، ورم، اطباء، رجوع، اعزا جیسے اصیل و ثقیل عربی الفاظ کو تو سمجھنا بھی ایک غیر عربی داں عامی کے لیے مشکل معلوم ہوتا ہے۔

ان کی غزل کا ایک شعر ہے:

کھا گئے بن کے بلا تیرے معنبر گیسو
جانِ عاشق کے لیے ہوگئے اژدر گیسو(۱۰)

اس میں معنبر کا لفظ رباعی مجرد عَنبَرَ یعنبر عنبرۃ سے مفعول بہ کا صیغہ خالص عربی ہے۔

اگلے شعر کے مصرع: عرق رخ سے بنے سبحۂ گوہر گیسو(۱۱)

میں عرق کا را متحرک منصوب ہے جو کہ عربی کا اختصاص ہے ورنہ اردو میں تو یہ لفظ عام طور سے را ساکن کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ پھر عرق پسینہ کے معنی میں جیسا کہ یہاں استعمال ہوا ہے وہ بھی عربی ہی میں ہے ورنہ اردو میں تو عرق، رس کے معنی میں مستعمل ہے۔ سبحہ کے لیے اردو میں تسبیح کا لفظ مستعمل ہے اور یہ سبحۃ (بمعنی مالا) خالص عربی لفظ ہے جو یقین کے یہاں مستعار لیا گیا ہے۔

تیری تحریک سے اے بادِ صبا کیا حاصل ہوگئے اور نقاب رخِ دلبر گیسو(۱۲)

اس شعر میں تحریک بمعنی چھیڑ چھاڑ اور حرکت دینا عربی مفہوم ہے ورنہ تحریک، اردو میں تو سب جانتے ہیں کہ Movement کے معنی میں آتا ہے۔

پنڈت برج نرائن چکبست نے اگرچہ اپنے والد کا بہت زیادہ زمانہ نہیں پایا کہ ان کی ولادت ۱۸۸۲ء میں ہوئی اور ۱۸۸۷ء میں اودت نرائن عالم آخرت کو سدھار گئے۔ تاہم مذکورہ بالا سطور سے اس کا اندازہ ضرور ہوجاتا ہے کہ چکبست نے جس گھر اور ماحول میں آنکھیں کھولیں خود اس میں عربی زبان و ثقافت کا کتنا اثر رسوخ تھا جب کہ اودت نرائن جی کوئی باقاعدہ شاعر نہیں تھے بلکہ ایک انگریزی تعلیم یافتہ اعلیٰ سرکاری افسر تھے۔

والد کے انتقال کے بعد چکبست کی تعلیم کا آغاز بھی ایک مولوی صاحب کے ہاتھوں ہوا جو انہیں گھر پر اردو فارسی پڑھانے آتے تھے۔ ۱۸۹۷ء میں مڈل بھی کاظمین مڈل اسکول سے پاس

کیا۔ اپنی تعلیم کے مختلف مراحل طے کرتے ہوئے چکبست نے ۱۹۰۷ء میں الہ آباد سے ایل ایل بی پاس کیا اور لکھنؤ کے مشہور وکیل سید شہنشاہ حسین رضوی کی زیر سرپرستی وکالت شروع کردی۔

نواب سید شہنشاہ حسین رضوی کا تعلق خاندان شاہی سے بھی تھا اس لیے لکھنوی امارت وثروت کا سارا شکوہ ان کے رہن سہن پر چھایا ہوا تھا۔ کچہری کی مشغولیات سے فارغ وقت میں شعروسخن کی سرگرمیاں رہتی تھیں۔ چکبست کی قانونی استعداد میں جلا پیدا کرنے کے علاوہ ان کے ادبی وتہذیبی ذوق کی تعمیر میں بھی نواب صاحب کا قابل ذکر کردار رہا۔

لکھنؤ کے اس تہذیبی امتیاز کا احساس چکبست کو خود بھی تھا۔ لکھنؤ یونیورسٹی کی تاسیس کے موقع پر خود چکبست کی گواہی ان ہی کے الفاظ میں یوں ثبت ہے:

''لکھنؤ اپنی گزشتہ عظمت اور تہذیب وشائستگی کے اعتبار سے فرد ہے۔ اسلامی سلطنت کے زمانہ میں تہذیب وتربیت کا مرکز دہلی کا یادگار قلعہ تھا مگر خاندان مغلیہ کے آخری دور میں دہلی کی بربادی روز بروز بڑھتی گئی اور آخرکار غدر کے طوفان میں جو کچھ رہی سہی عظمت تھی وہ مٹی میں مل گئی۔ دہلی کے اجڑنے سے پہلے ہی لکھنؤ میں اسلامی تہذیب کا دوسرا مرکز قائم ہوگیا تھا اور دلی کی بربادی کے بعد وہاں کے تمام آوارہ وطن صاحبان فن کو لکھنؤ نے اپنے دامن کے سایہ میں جگہ دی اور چوں کہ اودھ کی سلطنت کا چراغ گل ہونے پر لکھنؤ میں کشت وخون کا ہنگامہ برپا نہیں ہوا اس لیے یہاں کی تہذیب وشائستگی کا سلسلہ برہم نہ ہونے پایا چنانچہ اس وقت لکھنؤ قدیم شائستگی وتہذیب کا مرکز ہے اور اس کے ذرہ ذرہ پر عظمت دیرینہ کا فسانہ نقش ہے''۔ (۱۳)

نواب مرزا محمد باقر خان عروج کی وفات پر لکھتے ہیں:

''اودھ کی سلطنت کے آخری دور میں جب کہ مختلف سوشل اور اخلاقی بدعنوانیوں کا بازار گرم تھا اور پولٹیکل مجبوریوں کی وجہ سے حکومت کا تاج آخری فرماں روائے اودھ کے سر پر لرز رہا تھا۔ لکھنؤ میں شعروسخن کا مذاق روز بروز ترقی کرتا گیا حتیٰ کہ رفتہ رفتہ اس یادگار خطہ کی زبان دہلی کی غلامی کی قید سے آزاد

ہوگئی اور خصوصاً یہاں کے محلات کی زبان سادگی اور نفاست کے اعتبار سے
ضرب المثل ہوگئی۔ اودھ کی سلطنت کا چراغ گل ہونے پر اس زبان کے اصل
وارث وہی لوگ تھے جن کا تعلق خاندان شاہی سے یا خاندان وزارت سے تھا۔
یہ پرانے گھرانے ایک ایک کر کے مٹتے جاتے ہیں......"۔(۱۴)

لکھنؤ کی جس تہذیب کے آغوش میں چکبست کی شخصیت کی نمو ہوئی وہ اسلامی رنگ کے غلبہ کے باوجود مذہبی رواداری کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ کشمیر کے متعدد مقتدر و تعلیم یافتہ پنڈت حضرات جن میں خود چکبست بھی شامل ہیں، شیعہ حضرات کے مجالس عزاء میں ہر سال اہتمام سے شرکت کرتے تھے۔ اور میر نفیس، اور حضرت عروج وغیرہ کے کلام اور مرثیہ خوانی سے محظوظ ہوتے تھے۔ مسلمان روساء، شرفا، ذوق وشوق سے ہندوؤں کے قومی تہواروں میں شرکت کرتے تھے۔

چکبست کی شخصیت و کردار اسی تہذیب سے ڈھل نکھر کر نکلی تھی جس پر آریائی وجاہت کے ساتھ ساتھ لکھنوی پاسداری و شرافت کی پوری چھاپ تھی۔ زندگی بہت سادہ تھی اور طبیعت میں بھی بہت سادگی تھی، گول کالی ٹوپی شیروانی اور چوڑی دار پائجامہ پہنتے تھے۔ یہی شرفا کا لباس تھا۔ حکیم آشفتہ لکھنوی فرماتے ہیں:

"چکبست نئی روشنی کے تعلیم یافتہ آدمی تھے تاہم لکھنؤ کی پرانی تہذیب
اور معاشرت کا صحیح نمونہ تھے۔ وہ مشاعروں اور ادبی اجتماعوں میں کبھی ننگے سر نہیں
جاتے تھے اور نہ کبھی کوٹ پتلون پہن کر شامل ہوتے تھے۔ بات چیت نشست
برخاست ہر چیز سے لکھنؤ کی بلند سوسائٹی اور اعلیٰ طبقہ کی تہذیب ٹپکتی تھی۔ وہ ایک
طرف متین وسنجیدہ تھے اور دوسری طرف نہایت ظریف وبذلہ سنج......"۔(۱۵)

گو ستم ہائے روزگار نے چکبست کو ادبی نگارشات کے لیے بہت زیادہ موقع فراہم نہ ہونے دیا، انہیں اس کا بہت احساس بھی تھا جس کا جا بجا انہوں نے اظہار کیا ہے تاہم انہوں نے جو کچھ کہا ہے یا لکھا ہے اس سے جہاں ایک طرف ان کے پاکیزہ ذوق کا اندازہ ہوتا ہے وہیں عربی اسلامی معاشرتی روایات سے ان کا بے پایاں تاثر بھی عیاں ہے۔

ان کے کلام میں ہر سطح پر بکھرے ہوئے کثیر التعداد اسلامی اشارے اور استعارے،

تلمیحات وترکیبات، خیالات وتصورات ظاہر ہے سب اپنی اصل کے اعتبار سے عربی ہیں۔

چکبست کے بالکل شروع کے دور کا جب انھوں نے وکالت کا پیشہ شروع ہی کیا تھا یہ پُرظرافت شعر:

خواب میں جب ملک الموت مقابل آیا دلِ ناشاد یہ سمجھا کہ مؤکل آیا

یا دوسرا شعر:

ہم لائے مؤکل کو تدبیر اسے کہتے ہیں وہ ہنس کے نکل بھاگا تقدیر اسے کہتے ہیں (۱۶)

اگرچہ ان کی نومشق آموزی کی مثال ہیں لیکن ملک الموت، مقابل، مؤکل جیسے متعدد عربی الفاظ کے علاوہ ملک الموت، تدبیر و تقدیر وغیرہ کے تصورات بھی چکبست کے یہاں بالواسطہ طور پر عربی ہی سے آئے ہیں۔

برہمن ہونے کے باوجود چکبست تشدد وتنگ نظری کے خلاف تھے اور ترقی وتجدد کے سودمند پہلوؤں کو وسعتِ نظری کے ساتھ قبول کرتے تھے۔ ہوائی جہاز کی ایجاد پر انھوں نے کہا تھا:

ہوا میں اڑ کے سیرِ عالم ایجاد کرتے ہیں فرشتے دنگ ہیں وہ کام آدم زاد کرتے ہیں (۱۷)

آدم زادوں کے کارناموں پر فرشتوں کا دنگ ہونا اس کا سارا دم خم ظاہر ہے سراسر اسی قرآنی مضمون پر مبنی ہے جو خلقت آدم کے وقت باری تعالیٰ اور فرشتوں کے درمیان کے مکالمہ کے سلسلہ میں مذکور ہوا ہے۔

ظاہر پرست ورسمی مذہبیت کے اوپر چوٹ کرتے ہوئے ایک شعر میں عربی اسلامی علامتوں کو یوں نظم کیا گیا ہے:

بلائے جاں ہیں یہ تسبیح اور زنار کے پھندے دل حق بیں کو ہم اس قید سے آزاد کرتے ہیں

اذاں دیتے ہیں بت خانہ میں جا کر شان مومن سے حرم میں نعرۂ ناقوس ہم ایجاد کرتے ہیں (۱۸)

تسبیح، اذان اور حرم کے الفاظ عربی پس منظر کی ہی علامتیں کہی جاسکتی ہیں۔

مندرجہ ذیل دونوں شعر بھی قابل غور ہیں:

انساں کے بغض وجہل سے دنیا تباہ ہے طوفان اٹھا رہا ہے یہ مشت غبار کیا (۱۹)

ازل کے دن مٹا دینا تھا اس مٹی کی عورت کو جگائے جس نے فتنے آفرینش کے بشر ہو کر (۲۰)

ازل کے دن عورت کا مٹی سے تخلیق ہونا یا انسان کا مشت غبار ہونا 'و آدم من تراب' کا اسلامی عربی تصور ہی ہے۔ پھر عورت کا فتنہ ہونا اس قرآنی آیت کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے جس کو بعض لوگ صنف نازک کی کج سرشتی کی دلیل بناتے ہیں۔'إن کیدکن عظیم' ہل گئے سات طبق ہوگئی دنیا ویراں میں 'سات طبق' ہندوستانی تصور نہیں بلکہ سبع سماوات طباقا سے عبارت ہے۔

بدھوا وواہ کی حمایت میں چکبست نے بہت کام کیا ہے۔اسی قسم کے ایک مضمون کے آخر میں جو یہ شعر ہے کہ:

ستانہ خاطر مظلوم کو ڈر اے قاتل پڑے نہ تیغ کبھی جیسے آہ پڑتی ہے (۲۱)

وہ اس فارسی شعر ہی کی بدلی ہوئی شکل ہے جس میں کہا گیا ہے:

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن اجابت از درِ حق بہر استقبال می آید

اور یہ بھی معلوم ہے کہ یہ مضمون اس نبوی تاکید سے مستفاد ہے جو زبان نبوت سے جا بجا ان الفاظ میں ادا ہوا ہے کہ:اتق دعوۃ المظلوم فإنہ لیس بینہ وبین اللّٰہ حجاب ۔

اپنے ایک ہندو استاد کے لیے چکبست نے ایک الوداعی نظم کہی تھی (۲۲) جس کا مطلع ہے ع

مبارک آپ کو اوجِ مراتب کا سوا ہونا مگر دل میں رہے گا دردمندوں سے جدا ہونا

لکھنؤ کے ایک ہندو طالب علم کی اپنے ہندو استاد کو بزبان اردو خراج عقیدت میں کہی گئی اس پوری نظم کا قلب وقالب جس طرح عربی اسلامی رنگ میں رنگا ہوا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ لکھنؤ کے تمدن کے فروغ میں عربی اسلامی روایات نے کتنا اہم کردار ادا کیا ہے۔اور نظم کے مندرجہ ذیل شعر:

کمالِ علم بھی آساں ہے اور جودت بھی آساں ہے مگر آساں نہیں ایسا دل درد آشنا ہونا

میں جودت بمعنی عمدگی کا لفظ تو اردو کے لیے میرے نزدیک ایسا نامانوس عربی لفظ ہے جس کے معنی تک رسائی بھی عام قاری کی آسان نہیں۔

ہم گنہ گاروں کو منظور نہ تھا اے خالق
حشر کے دن تری رحمت سے پشیماں ہونا (۲۳)

یا

خدا کو حشر میں وہ بے گنہ کیا منھ دکھائیں گے
جو دنیا میں رہے رحمت سے اس کی بے خبر ہوکر (۲۴)

یا اس جیسے اشعار میں حشر و حساب وغیرہ کے تخیلات کا تعلق چکبست کے اپنے عقائدی پس منظر سے نہیں بلکہ اسلامی عربی عقائد سے ہے۔اسی طرح کوثر و تسنیم ،فردوس و بہشت وغیرہ کے اشارات جیسے ان کی نظم ’دولت‘ کا یہ بند جس میں متعدد اسلامی قرآنی عربی تصورات یکجا طور پر مل سکتے ہیں:

ہوں طالبِ تحقیق کہ دل دادۂ تعلیم
خم سامنے دولت کے ہے سب کا سرِتسلیم
سنتے ہیں انہیں کے لیے ہیں کوثر و تسنیم
جویاں رہِ مولا میں لٹاتے ہیں زر و سیم
دنیا ہی میں کچھ ذکر نہیں تازہ ہے اس کا
دربار میں اللہ کے آوازہ ہے اس کا (۲۵)

یہاں تک کہ بعض اشعار و افکار تو سرتاسر نصوص اسلامی کا عکس کہے جا سکتے ہیں۔مثلاً ذیل کا یہ شعر:

آسماں زندہ دلوں پر بھی ترس کھاتا نہیں
یہ رلاتا ہے انہیں رونا جنہیں آتا نہیں (۲۶)

ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء اورمن لا یرحم لا یرحم کے، نبی عربی کے فرمان کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔ورنہ ہندو مائی تھولوجی میں دیا کرنے کی بہت کچھ ترغیب تو ضرور ہے لیکن آسمان سے اس کا رشتہ من فی السماء ہی کے زیر اثر قائم کیا گیا ہے۔

’جلوۂ صبح‘ کا یہ بند بھی ملاحظہ ہو جو کسی مسلمان شاعر کی حمد باری تعالیٰ کا حصہ نہیں بلکہ لکھنؤ کے ایک برہمن پنڈت برج نرائن چکبست کی کاوش قلم کا نتیجہ ہے:

مرغانِ چمن عالم مستی میں سحر دم
وصفِ چمن آرائے جہاں کرتے تھے باہم

شاخیں تھیں کہیں گردنِ تسلیم صفت خم
تسبیحِ خدا میں ہمہ تن محو تھی شبنم
غنچوں کے بھی تھی وردِ زباں حمد خدا کی
آتی تھی چٹکنے میں صدا صل علیٰ کی (۲۷)

بندکو تُسبِّحُ لہ السمٰوات السبع والارض ومن فیھن اوروان من شئی الا یسبح بحمدہ اورألم تر ان اللہ یسبح لہ من فی السماوات والارض والطیر صافات، کل قد علم صلاتہ وتسبیحہ جیسے عربی مقولات کا مفہومی ترجمہ کہا جائے تو شاید کچھ مبالغہ نہ ہوگا۔ نیز

مردِ قانع کو نہیں رہتی گدائی کی ہوس
پاؤں پھیلا کر جو بیٹھا ہاتھ پھیلاتا نہیں (۲۸)

ان الغنی غنی النفس ہی کا عربی مضمون ہے۔ اسلامی عقائد وروایات کے علاوہ کلام چکبست میں جا بجا قرآنی کرداروں مسیح، موسیٰ، طور وغیرہ کی تلمیحات وتفصیلات سے بھی کام لیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

اہلِ غیرت کا ہے یہ قول مسیحا سے بھی
موت سے کم نہیں منت کشِ درماں ہونا
میں بھی مشتاقِ تجلی ہوں مگر ہوں خاموش
یاد ہے طور پر موسیٰ کا پریشاں ہونا (۲۹)

یا ان کی خوبصورت نظم کشمیر کا یہ شعر:

ہے خطۂ سرسبز میں اک نور کا عالم
ہر شاخ و شجر پر شجرِ طور کا عالم (۳۰)

یا ان کی نظم جلوہ صبح کا یہ بند:

تھا پیشِ نظر وادیٔ ایمن کا تماشا
ہر شاخ و شجر میں شجرِ طور کا نقشا

تھا آتشِ گل میں اثر برق تجلّیٰ
مدہوش تھے مرغانِ ہوا صورتِ موسیٰ
شکلِ یدبیضا تھی ہر اک شاخ نظر میں
اعجاز کا گل تھا کفِ گلچینِ سحر میں (۳۱)

اس بند میں تجلّی کی جگہ تجلّیٰ)بفتح اللام) کا استعمال پنڈت جی پر مثنوی شریف کے اس مصرع کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ بسوز تجلّیٰ بسوز د پرم، ترک تجلّی کو تجلّیٰ ہی کے تلفظ میں بولتے ہیں۔

عربی فلسفہ اور تصوف کا ہندوستانی فکر اور تمدن پر غیر معمولی اثر پڑا ہے، بھگتی کی پوری تحریک اسی کا مظہر ہے۔ لہٰذا عقائد کے علاوہ چکبست نے عربی تصوف وفلسفہ سے جو اثر قبول کیا ہے وہ بھی ان کی تخلیقات کا جزو بنا ہے۔ وجودِ انسانی کی حقیقت کا جو تصور عربی تصوف کے راستہ سے آیا ہے اسے چکبست کے مندرجہ ذیل مشہور اشعار میں صاف طور سے دیکھا جا سکتا ہے:

زندگی کیا ہے ؟ عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے ؟ انہیں اجزاء کا پریشاں ہونا (۳۲)

جہاں میں رہ کے یوں قائم ہوں اپنی بے ثباتی پر
کہ جیسے عکس گل رہتا ہے آبِ جو کے گلشن میں (۳۳)

تصوف کے فلسفۂ فنائیت کا عکس چکبست کے شعر میں یوں رونما ہوا ہے:

مٹانا تھا اسے بھی جذبۂ شوقِ فنا تجھ کو
نشانِ قبر مجنوں داغ ہے صحرا کے دامن میں (۳۴)

تصوف بالخصوص وحدت الشہود کا فلسفہ، لاموجود الا اللہ، اور صوفیانہ تحیر ذیل کے اشعار کا مرکزی خیال ہے:

ہم کو منظور ہے اے دیدۂ وحدت آگیں
ایک غنچہ میں تماشائے گلستاں ہونا (۳۵)

مری بیخودی ہے وہ بیخودی کہ خودی کا وہم وگماں نہیں
یہ سرورِ ساغر مئے نہیں یہ خمارِ خواب گراں نہیں

جو ظہورِ عالم ذات ہے یہ فقط ہجوم صفات ہے
ہے جہاں کا اور وجود کیا جو طلسمِ وہم و گماں نہیں
یہ حیاتِ عالمِ خواب ہے نہ عذاب ہے نہ ثواب ہے
وہی کفر و دیں میں خراب ہے جسے علم راز جہاں نہیں
وہ ہے سب جگہ جو کرو نظر، وہ کہیں نہیں جو ہو بے بصر
مجھے آج تک نہ ہوئی خبر وہ کہاں ہے اور کہاں نہیں (۳۶)

متصوفہ کے ایک طبقہ کے یہاں طریقت اور شریعت کی چپقلش کا رجحان قائم ہوا تھا۔ 'صوفی' کی 'ملا' پر اس تنقید کا چربہ چکبست یوں اتارتے ہیں:

یا خوف خدا یا خوف سقر ہیں دو ہی بیاں تیرے واعظ
اللہ کے بندے دل میں ترے ہے سوز و گداز محبت بھی (۳۷)

جناب شیخ کو یہ مشق ہے یاد الٰہی کی
خبر ہوتی نہیں دل کو زباں سے یاد کرتے ہیں (۳۸)

چکبست لکھنؤ کی جس تہذیب کے پروردہ تھے وہاں شیعی رنگ غالب تھا۔ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ چکبست اہتمام سے مجالس عزاء میں شریک ہوا کرتے تھے۔ ان شیعی اقدار و روایات اور رسوم و رواج کے وہ انعکاسات بھی چکبست کے یہاں فطری طور پر پائے جاتے ہیں جن کو عربی ثقافت سے ان کے اور لکھنوی تہذیب کے عمومی تاثر کے ایک پہلو کے طور پر دیکھا جانا چاہیے۔ کیونکہ لکھنؤ یا ہندوستان میں اصلاً یہ روایات ایران کے راستہ عرب عراق سے ہی آئی ہے۔ ذیل کے اشعار دعوتِ غور و فکر دیتے نظر آتے ہیں، جن میں ماتم، ماتم کدہ، نوحہ خواں، مرثیہ خوانی، عزاخانہ وغیرہ جیسی تعبیرات و اشارات کے علاوہ ان کا عمومی غم آ گئیں اور قنوطی رنگ اسی پس منظر کی دین ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

مرے ماتم کدہ میں رات کا پردہ غنیمت ہے
اداسی اور بڑھ جاتی ہے اس گھر میں سحر ہو کر (۳۹)

کس کو غم ہے جو کرے مرثیہ خوانی میری

رو رہی ہے میرے مرقد پہ جوانی میری (۴۰)
دل مایوس محبت کا عزاخانہ ہے
اپنی آنکھوں میں یہ دنیا نہیں ویرانہ ہے (۴۱)
یہ ماتم ہے مصور اٹھ گیا گلزارِ قدرت کا
ہر اک طائر ہر اک برگ چمن ہے نوحہ خواں میرا (۴۲)

چکبست ہندو برہمن تھے اور اسلامی عربی ثقافت سے لاکھ تاثر، اپنے لبرل رویہ، اور قومیت پرستی کے بعد بھی وہ برہمن رہے۔ اپنے ہندو پس منظر سے جذباتی لگاؤ اور اس کی پاسداری کا ان کو خیال تھا جو ان کے مختلف شعری رویوں سے مترشح ہوتا ہے۔ رامائن کا ایک سین، گائے، اور سیر دہرہ دون وغیرہ اسی رنگ کی نمائندہ نظمیں ہیں تاہم لکھنؤ کی تہذیب پر عربی اسلامی ورثہ کا جو اثر تھا اس کی جھلکیوں سے ان کی یہ نظمیں بھی خالی نہیں ہیں۔ عربی لفظیات کے علاوہ خیالات و مضامین میں بھی عربیت کا رنگ و آہنگ ہے۔ مثلاً مندرجہ ذیل شعر میں عقیدۂ تناسخ کو یوں نظم کیا گیا ہے:

عروسِ جاں نیا پیراہنِ ہستی بدلتی ہے
فقط تمہید آنے کی ہے دنیا سے گزر جانا (۴۳)

اور 'گائے' کا یہ بند بھی ملاحظہ ہو:

صاحبِ دل تجھے تصویر وفا کہتے ہیں
چشمۂ فیضِ خدا مردِ خدا کہتے ہیں
دردمندوں کی مسیحا شعراء کہتے ہیں
ماں تجھے کہتے ہیں ہندو تو بجا کہتے ہیں (۴۴)

بعض جگہ ایسا بھی ہے کہ عربی و ہندی دونوں فکری رووں کو یکجا پیش کیا گیا ہے جیسے گوکھلے کے مرثیہ پر ان کا یہ شعر:

جنازہ قوم کا گھر سے ترے نکلتا ہے
سہاگ ہند کا تیری چتا میں جلتا ہے (۴۵)

یا بال گنگا دھر تلک پر ان کی نظم کے یہ اشعار:

شور ماتم نہ ہو ، جھنکار ہو زنجیروں کی
چاہیے قوم کے بھیشم کو چتا تیروں کی
لاش تیری نہ سنواریں یہ رقیبانِ کہن
ہو جبیں کے لیے صندل کی جگہ خاکِ وطن (۴۶)

عرب تمدن سے چکبست کا تاثر کہیں خالص بدویانہ وصحراوی عرب زندگی کی تجلیات کی شکل میں بھی ظاہر ہوا ہے۔ چکبست کہتے ہیں:

مجھے چھوڑے چلے جاتے ہیں پیچھے قافلے والے
کھٹکتا ہوں نگاہوں میں غبار کارواں ہوکر (۴۷)

صحراوی بگولوں اور صحرا نورد قافلوں سے ہندوفارس کے مرغزاروں کی آشنائی پہلے پہل عرب کے ریگزاروں ہی کے توسط سے ہوئی ہے۔ پھر وہاں پنپنے والی محبت کی حسین داستانیں اور ان کے کرداروں کو یہاں اس طرح اپنایا گیا کہ وہ ہندوستانی تمدن کا جزء بن گئے۔ چکبست بھی کہیں فرہاد و قیس کا تذکرہ کرتے ہیں اور کہیں آہوانِ حرم کی کلیلوں کو یاد کرتے ہیں:

قصے لکھے ہوئے ہیں جو فرہاد و قیس کے
کھوئے ہوئے ورق وہ مری داستاں کے ہیں (۴۸)

پڑی ہیں تیر بن بن کر نگاہیں پارساؤں کی
غزالانِ حرم بھولے ہوئے ہیں شوخیاں اپنی (۴۹)

باعثِ ننگ نہ اے گوشۂ داماں ہونا
خارِ صحرائے جنوں سے نہ پشیماں ہونا
لاش پر قیس کی دل میں یہ کہا لیلیٰ نے
آج معلوم ہوا نجد کا ویراں ہونا (۵۰)

چکبست کا براہ راست عربی ادب کے سرچشموں سے فیضیاب ہونا تو معلوم نہیں لیکن بعض جگہ ان کے کلام میں کچھ عرب شعراء کا تاثر واضح طور پر معلوم ہوتا ہے۔ ان کی نظم 'آبِ انگور' (۵۱)

ویسے تو ساری شراب کی مذمت میں ہے لیکن ذیل کے بند میں ابونواس کی خمریات اور وصف خمر کے اسلوب کا صاف پرتو نظر آرہا ہے۔

کھینچی شراب تو کی بادہ کش نے یوں تعریف
بجا ہے کیجیے آبِ طرب کی جو توصیف
مزا شباب کا آئے پیئے اسے جو ضعیف
دماغ ہو ترو تازہ و پاک و صاف و لطیف
کہا ہے پھول تو کچھ اس میں گفتگو بھی ہے
گلوں کا رنگ بھی ہے اور گلوں کی بو بھی ہے

تنقید و بلاغت کے معیار اور حسن و قبح کی حس میں بھی چکبست بہت حد تک عرب روایات ہی کے زیر بار احسان نظر آتے ہیں۔ پنڈت دیا شنکر مثنوی گلزار نسیم کے دفاع میں چکبست کی حالی پر تنقید پر رد بعنوان مولانا حالی کا ہوا سے لڑنا اور اقبال کے نواب بھاولپور کی شان میں ایک مدحیہ قصیدہ پر تنقیدی مضامین سے یہ بات بخوبی عیاں ہے۔

'کلام اقبال' (۵۲) کے عنوان سے اپنے مضمون میں چکبست فرماتے ہیں: ''یہ مانا کہ مبالغہ شاعری میں جائز ہے مگر ایک حد تک، ایک معمولی والیٔ ریاست کے قصیدے کی تمہید اس رنگ پر اٹھانا بالکل ناموزوں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قصیدۂ مذکور مبالغے کی حد سے گزر کر ہجو ملیح کا پہلو دبائے ہوئے ہے۔ یہ یاد رہے کہ تناسب شاعری کا خاص جوہر ہے''۔

اسی قصیدے کے ایک شعر پر تنقید کرتے ہوئے چکبست یوں رقم طراز ہیں:

''ساتواں شعر ہے:

برگِ گل کی رگ میں جنبش ہے رگِ جاں کی طرح
ہے امیں اعجاز عیسیٰ کی کہ افسوں گر زمیں

پہلے مصرع کی بندش نہایت شستہ و پاکیزہ ہے لیکن مصرع ثانی میں ایسی غلطی موجود ہے جو کہ سچے شاعر کے کلام میں کبھی نہ ملے گی۔ یعنی جس حالت میں کہ زمین کو اعجاز عیسیٰ کا امین قرار دیا ہے تو دوسرا جملہ ثانیہ ایسا ہونا لازمی ہے جو کہ اعجاز عیسیٰ کے امین ہونے سے بھی کوئی اعلیٰ صفت ظاہر

کرے نہ کہ افسوں گری ......اگر مصرع مذکورہ کی بندش اس صورت پر ہوئی کہ زمیں افسوں گر ہے، کہ اعجاز عیسیٰ کی امیں تو چنداں قباحت نہ تھی کیوں کہ تعریف میں بتدریج اضافہ ظاہر ہوتا ہے"۔

مذکورہ بالا اقتباسات سے جہاں چکبست کی تنقیدی صلاحیت اور بلاغت کے اصولوں سے واقفیت کا پتہ ملتا ہے وہیں ان پر عربی تنقید و بلاغت کے اصولوں کے اثرات بھی عیاں ہیں۔

عربی زبان وثقافت کا یہ اثر چکبست کی ادبی نگارشات ہی تک محدود نہیں تھا بلکہ ان سے تجاوز کر کے ان کے سماجی رویوں تک میں ظاہر ہوا ہے، بلکہ یوں کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ پہلے افکار و تخیلات تبدیلیاں و تاثر قبول کرتے ہیں پھر وہی اظہار کی مختلف شکلوں میں سامنے آتے ہیں۔ چنانچہ عربی اسلامی ثقافت کے یہی بالواسطہ اور راست، شعوری اور غیر شعوری ردعمل واثرات ہیں جو بدھوا واہ کی تحریک کی پرزور حمایت، ذات پات کے خلاف بغاوت، قومیت پرستی اور عمومی لبرل رویہ میں چکبست کے یہاں، لکھنؤ کے کشمیری پنڈتوں میں اور عام طور سے موجودہ ہندوستانی سماج کی مختلف جہتوں کے فروغ میں کارفرما رہے ہیں۔

حواشی

(۱) گذشتہ لکھنؤ، عبدالحلیم شرر، ص ۵۱۔ (۲) ایضاً، ص ۱۲۷۔ (۳) ایضاً، ص ۱۵۴۔ (۴) ایضاً۔ (۵) فسانۂ آزاد، ص ۵۹۔ (۶) ایضاً، ص ۱۲۹۔ (۷) چکبست، حیات وخدمات، ص ۱۵، بحوالہ چکبست اور باقیات چکبست؛ کالیداس گپتا۔ (۸) بہار گلشن کشمیر، چکبست اور باقیات چکبست؛ کالیداس گپتا، ص ۱۶۔ (۹) ایضاً، ص ۱۷۔ (۱۰) ایضاً، ص ۱۸۔ (۱۱) ایضاً۔ (۱۲) ایضاً۔ (۱۳) لکھنؤ یونیورسٹی، صبح امید، مارچ ۱۹۲۱ء، بحوالہ چکبست اور باقیات چکبست؛ کالیداس گپتا، ص ۲۳۸۔ (۱۴) مرقع لکھنؤ، مارچ ۱۹۲۶ء، ص ۱۳، نواب مرزا محمد باقر علی خاں عروج، بحوالہ چکبست اور باقیات چکبست؛ کالیداس گپتا، ص ۲۴۳۔ (۱۵) چکبست اور باقیات چکبست؛ کالیداس گپتا، ص ۴۴۔ (۱۶) چکبست حیات وخدمات، ص ۲۱۔ بحوالہ چکبست اور باقیات چکبست؛ کالیداس گپتا۔ (۱۷) انتخاب کلام چکبست، عبدالستار ردولوی، ص ۱۴۷۔ (۱۸) چکبست اور باقیات چکبست؛ کالیداس گپتا، ص ۴۸۔ (۱۹) انتخاب کلام چکبست، عبدالستار ردولوی، ص ۱۴۶۔ (۲۰) چکبست اور باقیات چکبست؛

کالیداس گپتا،ص ۵۸۔(۲۱)ایضاً،ص ۱۶۰۔(۲۲)بہار گلشن کشمیر، لاہور، فروری ۱۳۹، ص ۴،بحوالہ چکبست اور باقیات چکبست؛ کالیداس گپتا،ص ۲۵۷۔(۲۳)چکبست حیات وخدمات،ص ۲۳۸۔بحوالہ چکبست اور باقیات چکبست؛ کالیداس گپتا۔(۲۴)مرقع جنوری ۱۹۲۶ء،بحوالہ چکبست اور باقیات چکبست؛ کالیداس گپتا،ص ۲۶۰۔(۲۵)انتخاب کلام چکبست،ص ۹۱۔(۲۶)زمانہ مارچ ۱۹۱۰ء،چکبست اور باقیات چکبست؛ کالیداس گپتا،ص ۲۶۳۔(۲۷)انتخاب کلام چکبست،ص ۹۷۔(۲۸)ایضاً،ص ۱۲۳۔(۲۹)چکبست حیات و خدمات،ص ۲۳۸۔بحوالہ چکبست اور باقیات چکبست؛ کالیداس گپتا۔(۳۰)انتخاب کلام چکبست،ص ۸۸۔ (۳۱)ایضاً،ص ۹۸۔(۳۲)ایضاً،ص ۱۴۳۔(۳۳)چکبست اور باقیات چکبست؛ کالیداس گپتا،ص ۵۱۔ (۳۴)ایضاً،ص ۵۰۔(۳۵)خمخانۂ جاوید،ج ۲،بحوالہ چکبست اور باقیات چکبست؛ کالیداس گپتا،ص ۲۶۱۔ (۳۶)انتخاب کلام چکبست،ص ۱۵۵۔(۳۷)ایضاً،ص ۱۴۶۔(۳۸)ایضاً،ص ۱۴۸۔(۳۹)زمانہ مئی ۱۹۱۰ء، چکبست اور باقیات چکبست؛ کالیداس گپتا،ص ۲۶۲۔(۴۰)خمخانۂ جاوید، ج ۲، ۱۹۱۱ء،بحوالہ چکبست اور باقیات چکبست؛ کالیداس گپتا،ص ۲۶۲۔(۴۱)انتخاب کلام چکبست،ص ۲۷۔(۴۲)ایضاً،ص ۱۵۱۔(۴۳) ایضاً،ص ۱۲۴۔(۴۴)ایضاً،ص ۶۲۔(۴۵)ایضاً،ص ۸۱۔(۴۶)ایضاً،ص ۸۴۔(۴۷)زمانہ ۱۹۱۰ء،چکبست اور باقیات چکبست؛ کالیداس گپتا،ص ۲۵۸۔(۴۸)انتخاب کلام چکبست،ص ۱۳۸۔(۴۹)ایضاً،ص ۱۱۹۔

رپورٹ دوروزہ سیرت سیمینار

کلیم صفات اصلاحی

دارالمصنّفین کے بانی علامہ شبلی نعمانیؒ نے سیرت نویسی کی جو اعلیٰ علمی و تحقیقی روایت قائم کی تھی اس کے اہم ترین مقاصد میں واقعات سیرت پر غور وفکر کرکے ان کو عہد حاضر کے تقاضوں کے مطابق پیش کرنا بھی شامل تھا۔اسی احساس کے تحت دارالمصنّفین میں گذشتہ چند برسوں سے سالانہ سیرت سیمینار کا آغاز کیا گیا ہے۔اس سلسلے کے دو سیمینار ''مصادر سیرت نبویؐ'' (۹/۱۰/ اکتوبر ۲۰۱۰ء) اور ''حضور اکرمؐ کی مکی زندگی'' (۱۷/۱۸/ مارچ ۲۰۱۳ء) منعقد کیے جا چکے ہیں۔ ثانی الذکر موضوع کے تحت پچھلے سال معراج،حلف الفضول،مظالم قریش کے اسباب ومحرکات، آپؐ کی دعوتی سرگرمیوں،خفیہ دعوت،اولین مکی آیات اور سورتوں کا پیغام،اشاعت اسلام اور اس کے ذریعے محمد عربی کا اسوۂ دعوت،تزویج خدیجہ،دعوت نبوی کا مکی مزاج واسلوب،ہجرت حبشہ، سفر طائف،دارارقم،قرآن مجید کی تدوین وکتابت،عہد مکی کے دعوتی ادوار،انساب الاشراف میں مکی روایات سیرت کا جائزہ،تبلیغ وارشاد کا آغاز وارتقاء وغیرہ پر تحقیقی مقالات پیش ہوئے تھے۔

موضوع کی غیر معمولی اہمیت کی وجہ سے اس سال بھی اسی موضوع کے تحت اہل علم کو دعوت تحقیق دی گئی تاکہ ان موضوعات وعناوین کا احاطہ کیا جا سکے،جو اپنی غیر معمولی اہمیت کے باوجود گذشتہ سال زیر بحث نہ آسکے تھے۔

اس دوروزہ سیمینار کی افتتاحی نشست ۲۳/ مارچ ساڑھے نو بجے دن میں منعقد ہوئی۔آغاز حافظ عبدالرحمٰن قمر عباسی کی تلاوت سے ہوا۔صدارت دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مہتمم اور انٹیگرل یونیورسٹی لکھنؤ کے چانسلر مولانا سعیدالرحمٰن الاعظمی صاحب نے کی۔کلیدی خطبہ مہمان خصوصی پروفیسر

محمد یٰسین مظہر صدیقی صاحب نے پیش کیا۔ناظم اجلاس مولانا محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی نے صدر اجلاس ومہمان خصوصی کے تعارف کے بعد سمینار کے مقاصد اور سیرت کے بعض قابل غور پہلوؤں کی جانب حاضرین کی توجہ مبذول کرائی۔

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے مندوبین کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ سیرت طیبہ کا مطالعہ محض ہماری علمی ضرورت نہیں ہے بلکہ شرف انسانیت کی تکمیل کے لیے اس کو اسوہ بنانا ہمارے مذہبی ودینی فرائض میں داخل ہے۔ہمارے پاس قرآن مجید اور سنت نبویؐ کی مکمل روشنی موجود ہے لیکن بدقسمتی سے ہم نہ تو صحیح طریقے سے اس سے خود مستفید ہورہے ہیں اور نہ ہی دوسروں کو اس سے استفادے کا موقع ہی فراہم کر پارہے ہیں۔آج کے پرتشدد اور غیر منصفانہ ماحول میں آنحضورؐ کی مکی زندگی کے صبر آزما حالات ہم مسلمانوں کے لیے اسوہ اور نمونہ ہیں اس لیے اس سے پوری واقفیت حاصل کرکے خود کو اس کے سانچے میں ڈھالنے اور دوسروں تک اس کو پہنچانے کی کوشش کرنا ضروری ہے اور اسی میں دین ودنیا کی کامیابی مضمر ہے۔

پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی نے اپنے کلیدی خطبہ میں مکی دور کی اہمیت کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ مکی دور نبوی اسلام کی تعمیر وارتقاء کا اصل میدان ہے۔انہوں نے شمائل نبوی، بعثت محمدی اور کار رسالت کا ارتقاء، قرآن مجید کی تنزیل اور اس کا مکی اسلوب، مکی احادیث، دلائل نبوت اور معجزات، مکی شریعت اسلامی، احکام اسلام کا آغاز وارتقاء، احکام وجوب سے احکام ندب تک، تبلیغ دین کی مکی میراث، تعلیم وتربیت اور تبلیغ وارشاد کے مراکز، امت اسلامی کا ارتقاء، مکہ و مدینہ کے باہمی روابط دارالاسلام / الہجرۃ کی تلاش، بیعت الحرب کی معنویت وغیرہ موضوعات پر بحث کرتے ہوئے بتایا کہ مکی دور اسلامی تہذیب وتمدن کا مردم ساز اور عہد ساز زمانہ ہے۔مزید براں سماجی لحاظ سے افراد کے نفوس کا تزکیہ اولین کار منصبی میں شامل تھا، اس لیے اس عہد کو گہرائی سے سمجھنے اور پڑھنے کی ضرورت ہے۔

مولانا سعید الرحمٰن الاعظمی نے اپنے صدارتی خطاب میں اس دینی وعلمی اجتماع میں شرکت پر خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ دارالمصنّفین کے احیاء کی کوششیں باعث مسرت ہیں۔سمینار کے موضوع پر فکر انگیز گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا حضور اکرمؐ سے پہلے جتنے بھی انبیاء آئے

انہوں نے اس انسانی مزاج کو بدلنے کی کوشش کی جس کے بارے میں فرشتوں نے تخلیق آدم کے وقت اندیشہ ظاہر کیا تھا۔آپؐ نے پوری زندگی اسی انسانی مزاج کو بدلنے میں صرف کردی، اس کے بدلے آپؐ پر مظالم کے پہاڑ توڑے گئے مگر آپؐ نے سب کچھ برداشت کیا،آپؐ کے بعد اس کی ذمہ داری تعلیم یافتہ افراد کے حصہ میں آئی۔علامہ شبلی نے بھی اس ادارہ کو اسی انسانی مزاج کی اصلاح وتبدیلی کے لیے قائم کیا تھا،اس کام کو جاری وساری رکھنا اس ادارے کے فرائض میں ہے جس کو یہ ادارہ اپنے قیام سے عہد حاضر تک بہ حسن وخوبی انجام دے رہا ہے۔ اس کے بعد یہ نشست اختتام کو پہنچی۔

مقالات کی پہلی نشست اسی روز ۱۲ بجے شروع ہوئی،اس کی صدارت ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن پٹنہ اور نظامت ڈاکٹر جمشید احمد ندوی نے کی،اس میں مولانا محمد فرمان ندوی استاد ندوۃ العلماء نے عہد مکی کے دعوتی مراکز، پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی علی گڑھ نے مکی عہد میں نبی کریمؐ کی معاشی زندگی،مولانا اعجاز احمد قاسمی استاذ جامعۃ الفلاح بلریا گنج نے اولین مکی مسلمانوں کی قبائلی اور خاندانی شناخت،ڈاکٹر عین الحق قاسمی نے رسول اکرمؐ کی عالمی نبوت پر تحقیقی بحث،ڈاکٹر محمد عارف عمری ممبئی سابق رفیق دارالمصنّفین نے قصہ حفر بئر زمزم اور ذبح جناب عبداللہ۔ایک مطالعہ کے عنوانات سے مقالات پیش کیے،صدر نشست کے صدارتی تاثرات کے بعد اس اجلاس کا خاتمہ ہوا۔

دوسرا اجلاس بعد نماز مغرب شروع ہوا،اس کی صدارت مولانا محمد عمر اسلم اصلاحی اور نظامت جناب اشہد رفیق ندوی نے کی۔اس میں کل پانچ مقالات پیش کیے گئے،ڈاکٹر احسان اللہ فہد فلاحی علی گڑھ نے مکی سورتوں میں اعجاز القرآن کا چیلنج قرآن کی روشنی میں،ڈاکٹر جمشید احمد ندوی نے بخاری شریف میں مکی عہد نبویؐ،ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی نے محمد عربی کی عالم گیریت، ڈاکٹر سمیع اختر فلاحی نے مکی دور کی مسلم شاعری،مولوی فضل الرحمٰن اصلاحی قاسمی اسکالر دارالمصنّفین نے ہجرت حبشہ کا قرآنی پس منظر، کے عنوان سے مقالے پیش کیے۔آخر میں صدر اجلاس نے اس سشن کے دوران اٹھائے جانے والے بعض اہم سوالات کا اطمینان بخش جواب دیا۔اس کے بعد مولانا مجیب اللہ ندوی پر ۲۰۱۲ء میں کرائے گئے سمینار کے مجموعہ مقالات ''افکار مجیب''

مرتبہ عبداللہ عمار کا پروفیسر اشتیاق احمد ظلی اور پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی کے ہاتھوں اجرا ہوا۔

تیسری نشست ۲۴/ مارچ ۹ بجے دن میں شروع ہوئی، اس کی نظامت ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی اور صدارت ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی نے کی، اس میں ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن پٹنہ نے مکی دور میں تبلیغ اسلام کے حدود اور عرب قبائل، مولانا محمد عمر اسلم اصلاحی نے مکی عہد میں معاشرتی استحکام کی نبوی کاوشیں، مولانا محمد نعیم الدین اصلاحی نے قرآن مجید کی تدوین و کتابت کا مکی نظام، ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی جامعی نے محمدی نبوت کا عالمی آغاز کے عنوان سے مقالات پڑھے، آخر میں صدر اجلاس نے مقالات پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔

چوتھی اور آخری نشست سوا گیارہ بجے شروع ہوئی، اس کی صدارت مولانا نعیم الدین اصلاحی اور نظامت ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی نے کی ، اس میں کلیم صفات اصلاحی نے انساب الاشراف میں شعب ابی طالب کی تفصیلات کا جائزہ، ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی نے مکی عہد میں مکہ سے باہر اسلام کی اشاعت ، جناب اشہد رفیق ندوی نے مشرکین مکہ کی قرآن سے مخاصمت ۔ اسباب ومحرکات کا تجزیہ، ڈاکٹر محمد مشتاق تجاروی دہلی نے شعب ابی طالب میں محصوری اور مولانا نسیم ظہیر اصلاحی نے مہاجرین حبشہ کی واپسی اور قصۂ غرانیق کے عنوانات سے مقالات پیش کیے، آخر میں صدر اجلاس نے مقالات پر تبصرہ کیا۔ ان نشستوں میں مذاکرات اور سوالات بھی خوب ہوئے جس سے مقالہ نگاروں اور حاضرین کو استفادہ کا موقع ملا۔

سمینار کی آخری نشست شکریہ اور سمینار کی کامیابی پر مندوبین کے تاثرات کے لیے خاص تھی اس کی صدارت پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی اور نظامت مولانا محمد عارف عمری نے کی، تاثرات کا اظہار کرنے والوں میں جناب اشہد رفیق ندوی، مولانا عتیق الرحمٰن پٹنہ، مولانا محمد عمر اسلم اصلاحی، مولانا محمد فرمان ندوی، ڈاکٹر سلمان سلطان اور پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی شامل تھے۔ صدر اجلاس کے اظہار خیال اور ناظم دارالمصنّفین کے اظہار تشکر پر اس مبارک محفل کا اختتام ہوا۔

اخبار علمیہ

’’قدیم مجلّات کے لیے حکم امتناعی‘‘

برطانیہ کے قومی محکمۂ صحت نے دانت کے ڈاکٹروں کے نام ایک حکم امتناعی جاری کیا ہے کہ مطب سے قدیم رسائل و جرائد ہٹا دیے جائیں، اس لیے کہ ان کا وہاں رہنا مریضوں کی صحت کے لیے نقصان دہ اور طبی اصولوں کے خلاف ہے، محققین کے مطابق دانت کے دواخانوں میں عموماً مریض اپنے نمبر کے انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں اور اس دوران وہ طبی اور تفریحی اخبار و جرائد کو الٹ پلٹ کر اپنا وقت گذارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ رسائل بیکٹیریا کے پھیلنے میں معاون ہوتے ہیں، اس لیے ایک ہفتہ سے زیادہ ان کا مطب میں رکھا جانا مناسب نہیں ہے۔ مونیکا سایمز کے مطابق یہ قدم اس لیے اٹھایا گیا ہے کہ ایک ملازم نے اپنی صحت کی تفتیش کے دوران ان قدیم مجلّات کے سلسلہ میں شکایت کی تھی۔ (مجلّہ المجتمع الاسبوعیہ، الکویت ۵/۳/۱۴ء شمارہ ۲۰۶۹)

’’حکومت ایران کا عالمی کتاب سال ایوارڈ‘‘

ایرانی حکومت ہر سال ایرانیوں اور غیر ایرانیوں کو ایران اور ادب فارسی پر تحقیقات کے لیے ایوارڈ سے نوازتی ہے، ان موضوعات پر ۲۰۱۲ء میں دنیا بھر میں غیر ایرانیوں کی شائع ہونے والی تحقیقات کا ایک ایرانی کمیٹی نے جائزہ لیا اور ’’فارسی کتابیات‘‘ کے موضوع پر مشہور پاکستانی محقق ڈاکٹر عارف نوشاہی کو ان کی تالیف ’’کتاب شناسی آثار فارسی چاپ شدہ در شبہ قارہ‘‘ پر حکومت ایران نے ’’عالمی کتاب سال‘‘ ایوارڈ دیا ہے۔ نوشاہی صاحب نے یہ ایوارڈ ۹/فروری ۱۴ء کو تہران میں وصول کیا، یہ کتاب چار جلدوں میں ۲۰۱۲ء میں ’’مرکز پژوہشی میراث مکتوب نے تہران سے شائع کی تھی، یہ اصلاً برصغیر میں ۱۷۸۱ء سے ۲۰۰۷ء تک طبع ہونے والی فارسی کتب کی فہرست ہے۔ جس پر ڈاکٹر عطا خورشید کا ایک تعارفی مضمون معارف اعظم گڑھ اکتوبر ۲۰۱۳ء میں شائع ہو چکا ہے۔

’’ایک نابینا بھکارن کی دولت‘‘

جدہ میں ایک نابینا بھکارن کی موت سے انکشاف ہوا کہ اس نے اپنے بعد ۳ سوملین ریال

نقدی، ایک ملین ریال کے جواہرات، سونے کے سکے اور جدہ کے وسط میں ۴ بڑی بڑی عمارتیں چھوڑی ہیں۔اس کے پڑوسی احمد الصعیدی کا بیان ہے کہ متوفیہ نے تقریباً سو برس کی عمر پائی تھی، ۵۰ برس سے وہ اپنی ماں اور ان دونوں بہنوں کے ساتھ بھیک مانگا کرتی تھی جو چند سال پہلے وفات پا چکی ہیں۔اس نے بتایا کہ اس کو ان کی دولت کا علم تھا اور کچھ سالوں سے وہ اس کی خدمت میں تھا اور اس کے لیے سونے کے سکے خریدتا تھا، ''اخبار عکاظ'' کے مطابق موت سے پہلے متوفیہ نے اس کو وصیت کی تھی کہ اس کا پورا اثاثہ ملک کے اس محکمہ کے حوالہ کردیا جائے جو محتاجوں اور لاوارثوں کے لیے کام کرتا ہے۔متوفیہ اور اس کے متعلق تمام تفصیلات پولیس کو فراہم کردی گئی ہیں۔ (اخبار المجتمع السعودی، ۱۴؍مارچ ۲۰۱۴ء)

''پارلیمنٹ میں مخالف شریعت بل کی نامنظوری''

مالدیپ کا شمار دنیا کے کثیر الجزائر ملک میں ہوتا ہے، یہ تقریباً ۱۲سو جزائر پر مشتمل ہے، آبادی کی اکثریت کا تعلق جنوبی ہند اور سری لنکا سے ہے، ۲۰۱۱ء میں سرکاری اعداد وشمار کے مطابق اس کی آبادی ۴ لاکھ نفوس پر مشتمل ہے اور اس کا سرکاری دین اسلام ہے۔اس کی پارلیمنٹ میں حال ہی میں ایک شریعت مخالف بل پیش کیا گیا جس کی رو سے دوسری شادی کے لیے پہلی منکوحہ سے باقاعدہ اجازت اور عدالت میں داخل طلاق کی درخواست کے دوران بیوی سے عدم صحبت کی شرط ضروری قرار دی گئی تھی، فقہ کمیٹی کی عدم منظوری کے باوجود پارلیمنٹ کی اکثریت نے اس کو منظور کرلیا تھا۔تاہم صدر عبداللہ یامین نے اپنے خصوصی اختیار کا استعمال کرکے اس بل کو نامنظور کردیا ہے۔ (صراط مستقیم، برمنگھم، فروری ۱۴ء، ص ۳۱)

''طیور کی ایک مخصوص نسل ایلا چورا فورموسا دریافت''

پرندوں کی بہت سی نسلیں اب معدوم ہورہی ہیں تاہم سائنس دانوں نے پاسیریڈا نسل کی چتکبری چڑیا دریافت کی ہے۔اس کے بارے میں محققین کا کہنا ہے کہ یہ یورپ کی مغنی چڑیا رین یا جنگلوں میں اونچے سروں میں گانے والی رین ببلر چڑیا سے مختلف اور اپنی نوعیت کی واحد نسل ہے، اس کو ''ایلا چورا فورموسا'' کے نام سے موسوم کیا جاسکتا ہے، یہ ایک چھوٹی سی مغنی چڑیا ہے جو مشرقی ہمالیائی علاقوں اور جنوب مشرقی چین کے درمیان پائی جاتی ہے اور انتہائی گھنے نیم استوائی پہاڑی جنگلوں میں

چھپ کر رہتی ہے اس کا مشاہدہ کرنا مشکل ہے، اس کے گیت اور سُر دوسری کسی ایشیائی چڑیا سے مشابہ نہیں ہیں، چونکہ یہ یورپ کی رین اور جنگلوں کی رین ببلر سے بہت مماثل ہے اسی لیے محققین نے اس کی جانب توجہ نہیں کی تھی، یہ مشابہت ایک خاص قسم کے ماحول میں نشو ونما پانے کے سبب در آئی ہے لیکن سائنس دانوں نے ڈی این اے تفتیش کے نتیجہ میں اس کی نئی نسل اور خاندان کا تعین کیا ہے۔ رائل سوسائٹی کے جریدے ''بایولوجی لیٹرز'' میں شائع یہ تحقیق بی بی سی اردو ڈاٹ کام پر ۵/مارچ کی اشاعت میں موجود ہے۔

''مقناطیسی مادے دریافت''

امریکی سائنس دانوں نے ایک انتہائی حساس مقناطیسی مادہ دریافت کرنے کا دعویٰ کیا ہے جس کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ یہ کمپیوٹرز کی ہارڈ ڈرائیوز اور توانائی ذخیرہ کرنے والے آلات میں انقلابی تبدیلیاں لاسکتا ہے، اس دوتہوں والے معدنی مادہ کو مقناطیسیت میں تبدیلی کے لیے معمولی درجہ حرارت کی ضرورت پڑتی ہے، نکل اور وینڈیئم آکسائڈ کی پتلی تہوں کے اتصال سے بنایا جانے والا یہ مادہ معمولی درجہ حرارت دیے جانے پر حیرت انگیز ردعمل دکھاتا ہے۔ اسے اصولاً بجلی کے وولٹیج سے قابو میں کر سکتے ہیں۔ سان دیاگو میں واقع یونیورسٹی آف کیلیفورنیا سے وابستہ محقق ایویں شیلر نے اپنی اس دریافت کو ڈینور میں امریکن فزیکل سوسائٹی کے اجلاس میں پیش کیا، انھوں نے تفصیلات سے مطلع کرتے ہوئے کہا کہ اگر آپ مستقبل میں حیرت انگیز انقلابی ٹیکنالوجی کے متلاشی ہیں تو اسی قسم کی تحقیق کرنے کی ضرورت ہے، انھوں نے کہا کہ ہمارے اب تک کے تجربہ کے مطابق یہ مادہ کم درجہ حرارت پر ایک غیر منفک اور زیادہ درجہ حرارت پر ایک دھات اور ان دونوں کے درمیان یہ ایک عجیب مادہ بن جاتا ہے، اس مادہ کو برقی نظام میں بھی استعمال کیا جاسکتا ہے، اس کے علاوہ اس قسم کی نئی چیزیں ٹیکنالوجی کے میدان میں غیر متوقع ایجادات کا سبب بھی بن سکتی ہیں، جس طرح ''جوائنٹ میگنیٹو ریزسٹینس کی دریافت سے ڈیجیٹل اشیا میں ہارڈ ڈرائیوز کا حجم بہت کم ہوگیا، تاہم انھوں نے یہ بات بھی کہی کہ ہم ابھی نہیں جانتے کہ اس کا بہتر استعمال کس طریقے سے ممکن ہے۔ (یہ خبر بی بی سی اردو ڈاٹ کام پر ۵/مارچ ۱۴ء کی اشاعت میں دیکھی جاسکتی ہے)

ک۔ص اصلاحی

معارف کی ڈاک

ترکی کے دور عثمانی کی مجوزہ مدینہ یونیورسٹی

حیدرآباد
۲۱ر جنوری ۲۰۱۴ء

سلطنت ترکی عثمانی کے دور آخر میں ''مدینہ یونیورسٹی سے متعلق علامہ شبلی نعمانیؒ کی ایک نادر تحریر'' آپ کا نوٹ پڑھا۔ (ماہنامہ معارف دسمبر ۲۰۱۳ء) حیدرآباد کی حکومت آصفیہ کے آرکائیوز میں بھی مجوزہ یونیورسٹی کا تذکرہ ملتا ہے بلکہ نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ ہفتم نے اس یونیورسٹی کے قیام سے خصوصی دلچسپی کا اظہار کیا تھا اور اس سلسلہ میں ضروری مالی اخراجات کی منظوری دی تھی مگر حجاز میں سیاسی حالات یک دم بدل گئے۔ والی حجاز نے سلطنت ترکی سے تعلقات منقطع کر لیے۔ بعد ازاں جنگ عظیم اول (۱۸-۱۹۱۴ء) چھڑ گئی اور ۱۹۲۴ء میں آل سعود نے حجاز پر قبضہ کر لیا اور تقریباً سارے جزیرہ نما عرب پر وہ حکمراں ہو گئے۔ شاہ سعود بن عبدالعزیز کے دور میں مدینہ یونیورسٹی کی تجویز کا احیاء ہوا اور اب وہ وہاں قائم ہے۔

اس سلسلہ میں یہ امر توجہ طلب ہے کہ ۵ر دسمبر ۱۹۱۳ء کو نواب میر عثمان علی خاں نظام حیدرآباد کے نام ایک ٹیلی گرام شیخ عبدالعزیز صاحب نے مدینہ منورہ سے ارسال کیا کہ سلطان ترکی (خلیفہ عبدالمجید) کی جانب سے مذکورہ یونیورسٹی کا سنگ بنیاد رکھا جا چکا ہے۔ چنانچہ نظام حیدرآباد نے ۹ر محرم الحرام ۱۳۳۲ھ کو اپنے مدار المہام سالار جنگ بہادر سے رائے طلب کی کہ اس بارے میں کس قدر مالی تعاون ریاست کی طرف سے کیا جانا چاہیے۔ (کیونکہ یہ ایک دینی اور مقدس مقام کا کام ہے)

اس فرمان کی تعمیل کے سلسلہ میں اولاً حافظ محمد انوار اللہ خاں بہادر (بانی جامعہ نظامیہ) و مدار المہام امور مذہبی کی رائے حاصل کی گئی۔ انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو دیے گئے چندے (دو قسطوں میں پانچ پانچ لاکھ روپیوں) کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ مجوزہ مدینہ یونیورسٹی کے لیے

اس رقم سے زیادہ دینا مناسب ہوگا۔ البتہ فریدوں جنگ بہادر مدار المہام سیاسیات کی رائے تھی کہ پہلے شریف مکہ سے دریافت کیا جائے کہ مذکورہ یونیورسٹی کی کانسٹی ٹیوشن (تنظیم) کس طرح ہوئی ہے اور کیا سلطنت عثمانی ترکی اس کا مالی بار خود برداشت کرے گی یا مسلم حکومتوں سے بھی مالی تعاون لے گی۔ نظام دکن کے فرمان مورخہ ۲۴ محرم الحرام ۱۳۳۲ھ کے بموجب شریف مکہ معظّمہ سے تفصیلات معلوم کرنے پر یہ کارروائی اختتام پذیر ہوئی۔ (مسل نشان ۳۳ بابتہ ۱۳۳۲ھ۔ دفتر مدار المہام سالار جنگ بہادر صیغہ پرائیوٹ سکریٹری)

نظام حیدرآباد کو مسلمانوں کے علوم دنیوی و دینی سے خصوصی دلچسپی رہی ہے۔ علی گڑھ کا ذکر ہو چکا۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کی تشکیل میں علامہ حمید الدین فراہیؒ کے مرتب کردہ اس خاکہ سے مدد لی گئی جو انہوں نے دار العلوم حیدرآباد میں علوم شرقیہ وعصریہ کی ایک درسگاہ جسے سالار جنگ اول نے قائم کیا تھا اور جس کو ترقی دینے کے مقصد سے علامہ موصوف کا تقرر ۱۹۱۴ء میں ہوا تھا)۔ حجاز میں بھی مکۃ المکرّمہ میں قائم مدرسہ صولتیہ (قیام ۱۸۷۶ء) جسے دہلی کی تجارتی برادری نے قائم کیا تھا اور جس کی مالی امداد میں ریاست حیدرآباد کا خصوصی تعاون شامل تھا۔

اس کے علاوہ مدینہ منورہ میں بھی مدرسہ نظامیہ (قیام ۱۹۲۹ء) کی مالی سرپرستی ریاست حیدرآباد سے کی جاتی تھی۔ دونوں مدرسوں کو علی الترتیب دوسو اور ایک سو روپے ماہانہ امداد دی جاتی تھی اس کے علاوہ مدرسہ صولتیہ کی عمارت کی تعمیر میں بھی مالی تعاون دیا گیا۔ اس مدرسہ کے ناظم محمد سعید صاحب تھے اور مدرسہ نظامیہ کے محمد عبد القوی صاحب ناظم تھے۔ بحوالہ مسلہ درج ذیل:

1) File No.N5/a12 of 1917, Political and Private secretary's office of the Nizam Govt.

2) File No.N1/c88 of 1342 F(1932) -do-

مجوزہ مدینہ یونیورسٹی قائم ہوجاتی تو مذکورہ دونوں مدرسے اس کے تعلیمی دائرہ میں آتے اور علامہ شبلی نعمانیؒ کا خاکہ پورا ہوتا مگر یہ ایک تاریخی المیہ ہے کہ علامہ شبلیؒ اور علامہ فراہیؒ کے علمی خاکے محض تاریخی ورثہ بن کر رہ گئے۔

سید شکیل احمد انور

محفلِ قرآن

قاسمی منزل، دیپا سرائے،
سنبھل۔ یوپی
یکم جنوری ۲۰۱۴ء

بہ گرامی خدمت محترم ایڈیٹر معارف، اعظم گڑھ

محترمی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ابھی دو دن ہوئے اپنی کتاب ''محفل قرآن'' پر معارف کے تبصرے (جون ۲۰۱۳ء) کے سلسلہ میں ایک ای میل اس تبصرے کی طلب میں کیا تھا، لیکن وہ آج مجھے دفتر الفرقان سے مل گیا ہے۔ ای میل میں میں نے عرض کیا تھا کہ یہ تبصرہ مجھے دفتر الفرقان لکھنؤ سے لندن بھیجا گیا تھا مگر میں کچھ ایسا مصروف (محفل قرآن سوم کی تیاری میں) تھا کہ ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ ڈال کے فرصت کے وقت کے لیے رکھ دیا، اور وہ فرصت مجھے اب لکھنؤ آ کے ملی تو تبصرہ پاس نہ تھا۔ اب آج عذر رفع ہوا ہے تو اولاً تو خوشی کا اظہار کروں گا کہ جلد دوم کا یہ تبصرہ بھی الحمدللہ جلد اول کے رنگ ہی کا رہا، اور ایک اطمینان کا سامان اپنی کاوش پر ہوا۔ اس کے بعد اصل مدعا کہ تبصرہ میں باندیوں سے جنسی استمتاع کے سلسلہ میں کتاب میں لکھے گئے کو ناکافی محسوس کرتے ہوئے جتنی عبارت کا حوالہ دیا گیا ہے اس کے آگے تو اپنے فہم کے مطابق ایک نکتے کی بات بھی ''کافی و شافی'' ٹھیراتے ہوئے عرض کی گئی تھی، جو یہ تھی کہ

> ''ان عورتوں کو اسٹیٹ کی طرف سے مسلمانوں میں تقسیم کر دینے کا جو نظام تھا اس کے ماتحت ان کی ملکیت میں جنسی استمتاع کا حق بھی اگر نہ شامل کیا جاتا تو یہ عورتیں معاشرے میں جنسی انارکی اور آوارگی کا ذریعہ بنے بغیر کیسے رہ سکتی تھیں؟''۔

پس کافی اور غیر اطمینان بخش ہونے نہ ہونے کی بات تو میرے خیال میں اس عبارت کے حوالہ سے ہونی چاہیے تھی۔ یا پھر یہ سمجھوں کہ اس بیانِ جواز کو بھی ذہن میں رکھتے ہوئے غیر اطمینان بخش ہونے کی بات کہی گئی ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر معارف کے تبصرہ نگار کے بارے میں یہ سمجھتے ہوئے کہ مانتے تو وہ بھی یہی ہوں گے کہ قرآن نے یہ حق دیا ہے (نہ کہ علامہ اسد مرحوم والا آزاد ذہن، جو سورہ مومنون کی آیت میں اِلَّا عَلَیٰٓ اَزْوَاجِھِمْ اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُھُمْ کی جیسی تصریح کے بعد بھی یقین نہ کر سکے کہ قرآن نے جنسی تعلق کے لیے عورتوں کی دو الگ الگ کیٹیگریز واضح طور پر بنائی ہیں)۔ میں انہی سے جاننا چاہوں گا کہ قرآن کے دیے ہوئے اس حق کا اس سے بہتر کیا جواز ان کے خیال میں پیش کیا جا سکتا ہے؟ مجھے بڑی خوشی ہوگی اگر اس سے بہتر کوئی حل کہیں سے مجھے مل سکے اور پھر کتاب کے اگلے اڈیشن میں اس کا اضافہ ہو جائے۔

والسلام

نیازمند عتیق سنبھلی

دارالمصنّفین کا سلسلۂ مکاتیب

مکاتیب شبلی (اول) (جدید) سید سلیمان ندویؒ

قیمت -/۱۵۰ روپے

مکاتیب شبلی (دوم) سید سلیمان ندویؒ

قیمت -/۳۵ روپے

برید فرنگ سید سلیمان ندویؒ

قیمت -/۳۵ روپے

مشاہیر کے خطوط بنام مولانا سید سلیمان ندویؒ ادارہ

قیمت -/۴۵ روپے

وفیات

مولانا محمد عالم مختار حق

(۱۳۴۹-۱۴۳۵ھ)

عارف نوشاہی

مولانا محمد عالم مختار حق ۵/اور ۶/مارچ ۲۰۱۴ء کی درمیانی شب لاہور، پاکستان میں وفات پا گئے۔ وہ کچھ عرصہ سے ضیق النفس کے مرض میں مبتلا تھے۔ان کا اصل نام ''محمد عالم'' تھا۔لاہور کے مشہور مورخ پیر غلام دستگیر نامی مرحوم نے ان کا تاریخی نام ''مختار حق'' (=۱۳۴۹ھ) تجویز کیا جو بعد میں ان کے اصل نام کا لاحقہ بن گیا۔مولانا محمد عالم مختار حق نادر فارسی، اردو، پنجابی کتب کے ایک وسیع کتب خانے کے مالک تھے۔ ان کا کتب خانہ پاکستان اور بیرون ملک کے محققین کے لیے بہت مفید اور مددگار تھا۔مولانا محمد عالم مختار حق نے زندگی بھر بہت سے علمی کام کیے۔مولانا غلام رسول مہر سے وابستگی کے باعث محمد عالم مختار حق ان کے بارے میں کام کرتے رہے۔مولانا مہر کے خطوط دو جلدوں میں مرتب کیے۔اواخر میں ان کی دلچسپی کا محور ڈاکٹر حمید اللہ کی تحریریں بن گئیں۔انہوں نے ڈاکٹر صاحب کی تحریریں اور مقالات ''نگارشات ڈاکٹر محمد حمید اللہ'' کے نام سے تین جلدوں میں شائع کیے۔انہوں نے ڈاکٹر وحید قریشی مرحوم اور ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو کی مراسلت بھی مرتب کر رکھی تھی جو اب ان کی وفات کے بعد ہی شائع ہو سکے گی۔انہوں نے متعدد مقالات بھی لکھے۔ان کے آخری مقالات میں سے قابل ذکر ''شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تصانیف کی مجمل کتابیات'' ہے جو ''ارمغان رفیع الدین ہاشمی'' (۲۰۱۳ء) میں شائع ہوا۔وہ ماہر پروف ریڈر تھے۔پاکستان میں علمی ادارے اور بعض افراد اپنی کتابوں کے پروف ان سے پڑھواتے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی نظر کتب میں کتابت کی غلطیوں پر رہتی اور وہ اپنے تبصروں میں ان کا برملا اظہار کرتے۔انہیں خطاطی سے بہت دلچسپی تھی اور اس موضوع پر ان کے کتب خانے میں بہت مواد تھا۔برصغیر کے ممتاز خطاط اور علامہ محمد اقبال کے مجموعوں کے خوش نویس عبدالمجید پروین رقم کی خطاطی کے جتنے نمونے ان کے پاس محفوظ تھے شاید ہی کسی کے پاس ہوں۔اپنے کتب خانے سے مصنّفین اور مقالہ نگاروں کی مدد کے لیے ہمہ وقت آمادہ رہتے۔وہ ''معارف'' اعظم گڑھ کے قدیم قاری تھے اور اپنی وفات سے سات گھنٹے قبل مجھ سے بذریعہ ٹیلی فون گفتگو میں معارف میں چھپنے والی بعض تحریروں پر تبصرہ کرتے رہے۔

ادبیات

نعت

(ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی کے نعتیہ مجموعہ کلام شعاعِ نوا سے متاثر ہوکر)

وارث ریاضی

وہ دل کہ جس میں یاد شہہِؐ دوسرا نہ ہو
دنیا و آخرت میں اسے کچھ بھلا نہ ہو

روشن ہے جن کے فیض سے دنیائے آگہی
ان پر یہ مری جانِ حزیں کیوں فدا نہ ہو

دنیا کو کیا ملے گی کبھی منزل مراد؟
انؐ کا پیام رشد اگر رہ نما نہ ہو

اللہ کی رضا اسے ہوگی نہیں نصیب
دوگام بھی جو راہِ نبیؐ میں چلا نہ ہو

انسان وہ کہاں میرے نبیؐ کی نگاہ میں؟
امن و اماں سے جس کا کوئی واسطا نہ ہو

اس رحمتؐ جہاں کا یہی تو پیام ہے
دنیائے زندگی میں کسی پر جفا نہ ہو

یہ روضۃ النبیؐ ہے ادب کا مقام ہے
اے دل ترے خلوص میں شامل ریا نہ ہو

پیشِ نظر مقامِ رسالت رہے مدام
شانِ رسول پاکؐ میں سہو و خطا نہ ہو

ان کے سوا ہے کون جہاں میں خدا کے بعد
جس کی نوازشوں کی کوئی انتہا نہ ہو

مثل رئیس (۱) میں بھی کہوں نعت مصطفیؐ
وصف نبیؐ میں مجھ سے غلوائے خدا نہ ہو

وارثؔ وہ حمد کیسی؟ وہ مدحِ رسولؐ کیا؟
جن میں لحاظِ خالق و خیر الوریٰ نہ ہو

---

(۱) ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی صاحب۔

کاشانۂ ادب، سکٹا دیوراج، پوسٹ بسوریا، وایا لوریا، مغربی چمپارن (بہار)، ۸۴۵۴۵۳۔

مطبوعات جدیدہ

اخوان المسلمون، تزکیہ، ادب، شہادت: از ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۱۲، قیمت ۲۱۰ روپے، پتہ: اردو بک ریویو ۳/۱۷۳۹ انیو کوہ نور ہوٹل، پٹودی ہاؤس، دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

آج جماعت اخوان المسلمون کے بارے میں ساری دنیا واقف ہو چکی ہے کہ مصر اور دیگر عرب ملکوں میں شریعت کے نفاذ اور اس کے لیے عوامی بیداری کی کشمکش، اسی جماعت کی مسلسل جد و جہد کا نتیجہ ہے، آج سے قریب تین سال پہلے جب یہ کتاب چھپی تھی تو اس وقت مصر کے آمر حکمراں حسنی مبارک کا زوال، اپنے انجام کو پہنچ رہا تھا، اس کے بعد تین برسوں میں سرفروشی کی یہ داستان اور رنگین ہو چکی ہے، تین سال پہلے اگر اس میں گذشتہ صدی کی عزیمت کی تاریخ تھی تو اب اس کے مطالعہ سے عبرت بھی حاصل کی جا سکتی ہے کہ اس طرح مقہور و مظلوم انسانوں نے خود کو ہر آزمائش میں ڈال کر، مطلق العنان فرماں رواؤں کی رعونت و فرعونیت کا طلسم پاش پاش کیا، اگرچہ ظلم و طغیان کا ایک نیا باب اور کھول دیا گیا ہے لیکن یقین تو یہی کہتا ہے کہ سرخ روئی، اہل حق کا حصہ اور نصیبہ ہے، فاضل مولف نے مطالعہ کے چند رخ متعین کیے، حسن البناء شہید سے ڈاکٹر محمد البدیع تک اخوان کے آٹھ مرشدوں کے حالات اور اخوان کے چند امتیازی اوصاف جیسے تصوف اور سیاست کا اجتماع، تشدد سے گریز لیکن مزاحمت کی تلقین اور ان کے نوشتوں میں ادب و ایمان کی دلکش آمیزش اور تحریک کے ثمرات کی شکل میں ادیبوں اور دانشوروں کی بڑی تعداد اور ان کے نظام تربیت کے عناصر، یہ سب اس خوبی اور جامعیت سے آگئے ہیں کہ اخوان کے بارے میں صحیح معلومات اور برحق نتائج کے حصول میں کوئی دشواری نظر نہیں آتی، فاضل مصنف نے گذشتہ صدی میں مصر میں وطنیت، قومیت، الحاد، زندقہ اور مغرب پرستی کے بت کدوں کی موجودگی کو تحریک اخوان کی تاسیس اور ایک مسلسل دعوت کی بنیاد قرار دیا ہے، تحریک کو کچلنے کے لیے ظالم حکمرانوں نے روز اول سے ہنگامہ دارو گیر بپا کیا، لیکن بتایا گیا کہ

قائدین تحریک نے جبر وتشدد سے ہمیشہ گریز کیا، وہ یہی پیغام دیتے رہے کہ اصل مقصد دعوت و اصلاح کے فریضہ کی انجام دہی ہے، انہوں نے داعی اور داروغہ کے فرق کو ہمیشہ ملحوظ نظر رکھا، شیخ ہیضی کا یہ قول صرف اخوان ہی نہیں ہر قلب مسلم کے لیے دردمندانہ پیغام ہے کہ قرآن مجید کی حکومت اپنے دلوں میں قائم کرلو، زمین پر یہ خود بخود قائم ہوجائے گی، مرشد مصطفیٰ مشہور نے یہ پیغام دیا تھا کہ ہمارے لیے لازم ہے کہ اسی راہ پر گامزن ہوں جو سنت رسول ہے یعنی ایمان وعمل اور محبت واخوت کی راہ، اس اصول میں کوئی تغیر وتبدل نہ ہو اور نہ افراط وتفریط ہو، اس پیغام کی اہمیت موجودہ حالات میں اور زیادہ ہوگئی ہے، آخر میں علامہ یوسف القرضاوی کے ایک مضمون کا ترجمہ 'اس کی ادا دلفریب، اس کی نگہ پاکباز' کے عنوان سے ہے، خوبی ترجمہ کے ساتھ یہ حسن انتخاب کی احسن مثال ہے، یہی نہیں پوری کتاب بڑے پراثر اسلوب میں ہے، ظاہر ہے یہ تاثیر خون جگر کے بغیر نہیں آسکتی۔

سید عبدالرب صوفیؒ، شخصیت اور شاعری: مرتبہ ڈاکٹر طٰہٰ فاروقی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات ۲۶۴، قیمت ۳۰۰ روپے، پتہ: ڈاکٹر یٰسین لائبریری، اناؤ، یوپی، دارالعلوم فتوح الاسلام شیخ واڑہ، اناؤ اور الہدیٰ ایجوکیشنل سوسائٹی، اناؤ، یوپی۔

یہ کتاب ایک ایسے بزرگ کے پاکیزہ احوال کا مرقع ہے جو قریب نصف صدی پہلے تک مستورالحال نہیں تھے لیکن صاحب کمالات ہونے کے باوجود ان کی شخصیت ایسے حجابوں میں رہی جن سے تجلی کے ظہور کامل میں نقص کی شکایت ہونا بے جا نہیں، مولانا عبدالباری ندوی، مولانا علی میاں اور مولانا منظور نعمانی جیسے علماء سے غایت تعلق اور تعلیم وتربیت اور تدریس میں پس منظر عصری اور جدید ہونے کے ساتھ مولانا تھانوی اور شاہ وصی اللہ سے بیعت نے ان کو علم و عمل سے آراستہ ایک دلنواز پیکر عطا کردیا تھا، ان کی ایک صفت پر سب متفق ہیں کہ وہ صاحب عزیمت تھے، حق کے لیے سود وزیاں کے ہر پیمانہ سے بے نیاز، اسی کے ساتھ قدرت نے ان کو شعروادب کا بڑا پاکیزہ ذوق عطا کیا، صوفی صافی تھے اس لیے برملا کہتے کہ

کام کے اشعار لکھ صوفی کہ ہے درکار کام ۔۔۔ داغ کی غزلیں اگر تو نے بھی دہرائیں تو کیا

ان کی ایک نظم شاعر طنزیہ شاعری کا شاہکار ہے جس میں انہوں نے بڑی جرأت سے نام نہاد ادب کے علم برداروں سے پوچھا تھا کہ ع ادب کے نام پر بے ہودہ رنج افزائیاں کب تک شاید یہی وہ صفت تھی جس کی جانب مولانا علی میاں نے اشارہ فرمایا کہ اندیشہ ہے کہ ان کے کلام کی دینی روح، ان کی دینی زندگی اور سب سے بڑھ کر تخلص صوفی اس انصاف کے لیے سد سکندری نہ بن جائے کہ وردی پوش اور ادب فروش ادیبوں اور نقادوں نے کبھی ایسے ادیب و شاعر کا قصور معاف نہیں کیا جس نے ادب کو دین اور اس کے تقاضوں سے آزاد نہیں سمجھا۔ ایسے با کمال انسان کی یادوں کو زندہ و تابندہ رکھنا ہی چاہیے اور اس ادائے فرض کے لیے اس کتاب کے لائق و نستعلیق مرتب تبریک و تحسین کے مستحق ہیں کہ انہوں نے مطبوعہ تحریروں کو یکجا کیا اور اہل تعلق سے نئے مضامین بھی حاصل کیے، فاضل مرتب کا ذوق شعری خود بھی منفرد اور اس سے زیادہ حفظ اشعار کی صلاحیت حیرت انگیز بلکہ ان کے قدردانوں کے نزدیک کرامت سے کم نہیں ہے اور یہ بھی ان کی کرامت ہی ہے کہ اس کتاب میں انہوں نے حضرت عبدالرب صوفی کے بارے میں پچاس سے زیادہ تحریریں حاصل کرلیں، اس طرح یہ مجموعہ مضامین اپنی افادیت کی وجہ سے بار بار پڑھنے کے لائق ہوگیا۔

تحقیق و تدوین، سمت و رفتار: از ڈاکٹر محمد موصوف احمد، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۳۶، قیمت ۳۰۰ روپے، پتہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔

تحقیق و تدوین کی سمت، رخ کرنے والے ان مسافروں سے کہیں زیادہ ہیں جن کی منزل طبع زاد اور ابداعی و اختراعی ادب ہے، اسی لیے رہ نوردان تحقیق کے لیے وقتاً فوقتاً کچھ اصول اور ضابطے بھی پیش کیے جاتے رہے ہیں کہ سمت و رفتار میں توازن قائم رہے، زیر نظر مجموعہ مضامین میں ایسی کئی اہم تحریروں کو شامل کیا گیا ہے جن سے تحقیق متن، اصول تدوین، اصول تحقیق پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے، ایسی تحریر بھی ہے جو اس بحث میں بطور مثال پیش کی جاسکتی ہے، بعض مضامین معیار کا جائزہ ہے اور چند مضامین تحقیق و تنقید کے باہمی رشتوں کے اظہار پر ہیں، لائق مولف نے اس مجموعہ کو طلبہ و طالبات کی ضرورتوں کے لحاظ سے مرتب کیا ہے لیکن واقعہ

یہ ہے کہ رشید حسن خاں، عطش درانی، حنیف نقوی، نسیم احمد، محمد زاہد، گیان چند جین، سید محمد ہاشم، ظفر احمد صدیقی، نور الحسن ہاشمی، وہاب اشرفی، رشید امجد، سحر انصاری، مناظر عاشق ہر گانوی وغیرہ کے یہ مضامین ہر اس قاری کے لیے مفید ہیں جو تصنیف و تالیف کا ذوق و جذبہ رکھتا ہو، بعض مضامین مشہور و متداول ہیں لیکن متعدد مضامین کو بڑے سلیقہ سے ایک لڑی میں پرونے کی یہ کاوش لائق داد ہے۔

عورت، قرآن کریم اور بائبل کی روشنی میں : مرتبہ ڈاکٹر حنا باری،
متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۴۰۰، قیمت ۲۴۰ روپے، پتہ: مکتبہ الفہیم، ریحان مارکیٹ، دھوبیا املی روڈ، صدر چوک مئوناتھ بھنجن، یوپی۔

مرتبہ، مقام، حقوق، تحفظ جیسے الفاظ کی اضافت آج جس لفظ سے سب سے زیادہ زبان پر ہے وہ لفظ نسواں ہے۔ مرتبہ نسواں، حقوق نسواں اور تحفظ نسواں کی اہمیت نے عورت ذات کو دائرہ عمل میں اس مقام پر پہنچا دیا کہ مرد و عورت کا فرق ہی نہیں رہا، اس کتاب کی مصنفہ نے اس عمل کو غیر فطری قرار دیا ہے جس کی وجہ سے سماج تباہ ہی نہیں ہو رہا ہے بلکہ یہ عورت کے لیے ایسا المیہ ہے جہاں اس کی خودی کو برباد کیا جا رہا ہے، عورت کیا ہے، اس کا مقام، معاشرہ انسانی میں کہاں ہے؟ ایسے سوالوں کے جواب میں بڑی دیدہ ریزی اور تلاش و جستجو سے قرآن مجید کے علاوہ بائبل کا مطالعہ کیا گیا اور مختلف ابواب میں بڑے مفید مضامین پیش کیے گئے اور اس ساری بحث کا خلاصہ عہد جدید کی مغربی عورت اور مسلمان عورت میں آ گیا، لیکن جس طرح بائبل کے قدیم نسخوں اور اس کے مشہور تراجم اور قرآن مجید کے نزول و جمع و تدوین پر محنت کی گئی ہے وہ واقعی قابل تحسین ہے۔ تقابل میں توازن قائم رکھنے کی خوبی بھی نمایاں ہے، مقدمہ مولانا محمد عمر اسلم اصلاحی کے قلم سے ہے جس میں انہوں نے "مطالعہ کی وسعت، فکر کی پختگی، جرأت اظہار اور اظہار جرأت" کی داد دی ہے، اس تحسین سخن شناس کے بعد مزید تعریف کی ضرورت ہی نہیں۔

ع-ص

رسید کتب

۱- اسلامی ثقافت اور ندوۃ العلماء : مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی، مکتبہ فردوس مکارم نگر، لکھنؤ، مکتبہ دارامین، لکھنؤ۔ قیمت =/۱۸۰ روپے

۲- افکار مجیب (مجموعہ مقالات دو روزہ قومی سمینار): ڈاکٹر عبداللہ عمار رشادی، مولانا مجیب اللہ ندوی، ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، رشادنگر، اعظم گڑھ، یوپی۔ قیمت =/۳۵۰ روپے

۳- شبلی شناسی کے سوسال : ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ، عقب آواس وکاس کالونی، اعظم گڑھ۔ قیمت =/۳۵۰ روپے

۴- عبدالسلام ندوی کی ادبی خدمات (تنقید کے حوالے سے): ڈاکٹر گلشن طارق، ماورا پبلیشرز، لاہور۔ قیمت =/۹۵۰ روپے

۵- عہد اورنگ زیب میں علماء کی خدمات : ڈاکٹر علاء الدین خاں، البلاغ پبلی کیشنز N-1، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی۔ قیمت =/۳۸۰ روپے

۶- عہد نبوی میں اختلافات، جہات، نوعیتیں اور حل : پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی، قاضی پبلیشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، B-35, نظام الدین (ویسٹ)، نئی دہلی۔ قیمت =/۱۹۵ روپے

۷- قرآنی مطالعات (سماجی، معاشی و سیاسی مسائل کے حوالہ سے): پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی، اسلامک بک فاؤنڈیشن ۱۷۸۱- حوض سوئیوالان، نئی دہلی۔ قیمت =/۱۲۰ روپے

۸- مولانا تھانوی اور ان کی تفسیر بیان القرآن ایک تحقیقی مطالعہ : ڈاکٹر ریحانہ ضیا صدیقی علیگ، نیوورک لائن پریس، لکھنؤ۔ قیمت =/۲۰۰ روپے

۹- مولانا محبوب الرحمٰن ازہریؒ حیات وخدمات : محمد عبدالرشید ندوی، مکتبہ ندویہ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔ قیمت =/۱۲۰ روپے

۱۰- مسافر حرم وسفرنامہ : عارف عزیز، ۲۰ گھاٹی بھڑ بھوجہ روڈ، تلیا، بھوپال۔

قیمت =/۱۰۰ روپے